قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان —— ۴۸ روپے
غیر ممالک —— ۱۱۰ روپے

ٹیلیفون
87 92 46
خط و کتابت
ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ
۴
چار روپے

جلد (۳۹) | جون ۱۹۸۶ء | نمبر ۶

فہرست

۱- لمعات ۲
۲- وحی خداوندی (محترم محمد عمر دراز) ۱۰
۳- عالمانِ زنّار پوش سے اظہارِ عقیدت ۱۵
۴- ذکر اللہ (محترمہ ثریا عندلیب) ۲۷
۵- علمائے دیوبند کا اسلامی مملکت کا تصور ۳۲
۶- ہندوؤں کے اصولِ سیاست ۳۳
۷- امراضِ کہن کے لئے نسخۂ کیمیا۔ (محترم حافظ محمد یعقوب تاجک) ۳۴
۸- حقائق و عبر ۳۶
(۱) پرویز صاحب کی قرآن فہمی کو تسلیم کرنا ہی پڑا۔
۲- علماء کے نزدیک قرآن مجید کا مصرف۔
۳- علماء کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں۔
۴- اخبارات کے رنگین ایڈیشن۔
۵- فرقۂ اہلحدیث میں مزید انتشار۔
۶- ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی مولوی حضرات سے مایوسی۔
۷- یہ اُمت کے لئے لڑنے والے علماء۔
۸- علامہ اقبال اور علماء۔
۹- علماء نے بھی دینِ اسلام کو فٹ بال بنا رکھا ہے۔
۱۰- خطبۂ حجۃ الوداع۔
۱۱- ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا محترم پرویز صاحب کو خراجِ عقیدت۔ (ایک وضاحت)
۹- نقد و نظر ۵۶
۱۰- سرسید احمد خاں (محترمہ شمیم انور) ۶۴

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر شیخ عبدالحمید۔ مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ لاہور۔ مطبوعہ: النور پرنٹرز، ۳/۴ فیصل نگر۔ ملتان روڈ۔ لاہور ۱۴۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ○ (۹۷/۲)

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا، شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعل راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادی طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ:-

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفےٰؐ رو

(معراج انسانیت از محترم پرویز صاحب ص۳۲)

حضور نبی اکرمؐ نے اپنی وحی کے مطابق جو نظام مملکت تشکیل فرمایا، اُس کی خصوصیت کبریٰ یہ ہے کہ اس میں:-

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ..... ○ (۶/۵۷)

آپؐ نے جب یہ ارشاد فرمایا کہ حاکمیتِ اعلیٰ، صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو حاصل ہے تو ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے حقِ حکومت میں کسی کی شرکت گوارا نہیں کرتے:-

.... لَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ○ (۱۸/۲۶)

اور یہ کہ میں خود بھی اُسی کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے:-

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَىَّ ○ (۶/۹)

قوانین کے متعلق آپؐ کو یہ حکم دیا گیا کہ ان کے متنازعہ فیہ امور میں بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے مطابق فیصلہ کریں:-

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ ٥ (۵/۴۸)

آپؐ اور آپؐ کے خلفائے راشدینؓ نے ایسا کیا اور دنیائے انسانیت نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ جب انسانی معاملات کے فیصلے خالصتہً بما انزل اللہ کے مطابق ہوتے ہیں تو زندگی کس قدر حسین و جمیل ہو جاتی ہے اور خالق کائنات کا یہ وعدہ کس طرح پورا ہوتا ہے کہ :-

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ٥ (۳/۱۳۹)

مومن بالائے ہر بالا ترے غیرتِ او برنتابد ہمسرے

حضورؐ کی تشریف بری کے بعد کچھ وقت تک یہ نظام قائم رہا اور انسانیت اس کے ثمرات سے لذت یاب ہوتی رہی لیکن وہی انسان جو احسنِ تقویم میں پیدا ہو کر وحیِ خداوندی کی بجائے اپنے جذبات کے اتباع سے اسفل سافلین بن جاتا ہے، یہ سبق زیادہ دیر تک یاد نہ رکھ سکا اور اس کے مفاد پرست گروہوں نے آگے بڑھ کر دام ہائے ہم رنگِ زمین بچھانے شروع کئے اور اپنی عیاریوں اور چالاکیوں سے اس نظام کی بساط الٹ کر رکھ دی اور پھر سے انسانوں کو اپنا محکوم بنا لیا۔

ہمارے صدرِ اوّل کے دور کے بعد، پہلی بار یہ آواز سر سید احمد خان علیہ الرحمۃ کی طرف سے بلند ہوئی کہ ہماری نکبت و زبوں حالی کی وجہ یہ ہے کہ :-

خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اور جب تک پھر سے قرآن کریم ہی کے بابِ عالیہ سے داد طلبی نہیں کی جاتی اور اپنی زندگی میں اصول و احکامِ قرآنی کی حکمرانی قائم نہیں کی جاتی، ہماری تقدیر بدل نہیں سکتی اور ہمیں وہ مقام دوبارہ حاصل نہیں ہو سکتا جو ہمارے خالق نے ہمارے لئے مقرر کر رکھا ہے اور جس پر حضور نبی اکرمؐ اور آپؐ کے خلفائے راشدینؓ نے امتِ مسلمہ کو سرفراز کیا تھا یعنی :

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا الخ ٥ (۲/۱۴۳)

"اور یوں ہم نے تمہیں ایک بین الاقوامی امت بنا دیا جو تمام اقوامِ عالم سے یکساں فاصلے پر ہے، نہ کسی کی طرف جھکی ہوئی، نہ کسی سے کھنچی ہوئی، تاکہ تم اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کرو اور تمہارے اعمال کا نگران تمہارا رسول ہو۔"

سر سید علیہ الرحمۃ کے بعد، انہی کے تتبع میں، تصورِ پاکستان کے خالق، حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ ... کے اجلاس منعقدہ ۱۹۳۰ء بمقام الٰہ آباد میں جب قوم کے سامنے پاکستان کا

تصور رکھا تو بتایا کہ اس مملکت کے حصول سے یہ ہوگا کہ :-

"اس سے اسلام کو اس امر کا موقع مل سکے گا کہ اس پر عربی ملوکیت سے جو غیر اسلامی اثرات غالب آچکے ہیں، اُن سے مخلصی حاصل کرے اور اپنی تعلیم اور اپنے تمدن کی تنظیم کر کے انہیں اپنی اصلی روح اور عصر حاضر کے تقاضوں کے قریب تر لا سکے۔"

اُن کی ساری تعلیم اور تگ و دو کا ماحصل یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے بالاستمرار قوم کو یہی درس دیا کہ:-

گر تو می خواہی مسلماں زیستن

نیست ممکن جز بقرآں زیستن

بانیٔ پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناح نے جب پاکستان کے حصول کے لئے عملی جدوجہد کا آغاز کیا تو اُنہوں نے اس مملکت کی خصوصیت یہ بتائی کہ :-

"اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے، جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی، قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں، اسلامی حکومت، قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی کا نام ہے اور حکمرانی کے لئے لامحالہ آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔"
(عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے طلباء سے گفتگو۔ اگست ۱۹۴۱ء)

انہوں نے اپنے نصب العین کے متعلق غیر مبہم الفاظ میں قوم کو بتا دیا کہ :-

"اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک (ہندوستان) سے اسلام کا نام و نشان تک نہ مٹ جائے تو اس کے لئے نہ صرف یہ کہ پاکستان ایک عملی نصب العین ہے بلکہ یہی اور صرف یہی واحد نصب العین ہے۔" (تقاریر قائداعظم جلد اول، ص ۲۹۷)

مختصراً یہ کہ ملت اسلامیہ ہندیہ نے اپنے خدا سے یہ وعدہ کیا کہ اگر وہ اپنی کرم نوازیوں کے تصدق انہیں وہ مملکت عطا کر دے جسے انہوں نے اپنی ملی جدوجہد کا گوہر مقصود ٹھہرایا ہے تو وہ اس میں اسی کی حاکمیت قائم کر دیں گے۔ یعنی انسانیت کی طرف اس کی آخری، مکمل، غیر متبدل اور محفوظ رہنمائی (القرآن العظیم) کو اس میں بطور ضابطۂ مملکت نافذ کریں گے۔

خدائے ذوالمنن نے مسلمانانِ ہند کی ان خواہشات اور ارادوں کے ساتھ کی جانے والی مساعی کو

لاہور

… بخشا اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو انہیں آزاد مملکت پاکستان کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ ہماری یہ خوش بختی اور عہد ہے اسے ایسے خوش آئے کہ اس نے تقسیم ہند کے نتیجہ میں وجود میں آنے والی دو آزاد مملکتوں، پاکستان اور بھارت میں سے ہمیں بھارت سے ایک دن پہلے آزادی ملنے کی فضیلت سے نوازا۔ (بھارت ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزاد ہوا تھا۔)

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، انسانیت کی تاریخ میں، حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعادت مہد کے بعد، پہلی بار روئے زمین پر ایک آزاد مملکت کے قیام کی آرزو، اللہ تعالیٰ کا تخت اجلال بچھانے کے وعدے کے ساتھ کی گئی تھی۔ اللہ جل شانہ نے اپنی پسندیدہ آرزو کرنے والوں کی اس آرزو کے صدقے نہ صرف ایسی کوششیں کرنے والوں کو آزادی کے ثمر سے بہرہ یاب کیا بلکہ پورے کرۂ ارض کے مظلوم و محکوم انسانوں کو یکے بعد دیگرے آزادی کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔

دنیا کے نقشے پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ ۱۳/۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی رات (مملکت پاکستان کے قیام کی رات) اپنے زمانہ ما قبل اور ما بعد کے درمیان ایک ایسی حد فاصل بنتی ہے جس سے دنیائے انسانیت سے غاصب اور جابر حکمرانوں کی صفیں یوں سمٹنا شروع ہوئیں کہ ایک طرف انگریز جیسی عیار قوم کی سلطنت کی حدیں، جن کے متعلق بڑے فخر سے کہا جاتا تھا کہ ان میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا، سکڑ کر صرف ان کے اپنے ملک انگلستان کے ساحلوں تک محدود ہو گئیں اور دوسری طرف وہ تمام اقوام جو غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھیں، آزاد مملکتوں کی شکل میں دنیا کے نقشہ پر ابھرنا شروع ہوئیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر ۱۳/۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی رات کو بجا طور پر ایسی رات کہا جا سکتا ہے جس نے زمانے کی قدریں بدل کر رکھ دیں۔

ملاحظہ فرمائیے کہ اس لیلۃ القدر (۲۷ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ بمطابق ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء) سے پہلے اور بعد، دنیائے انسانیت کے کیا نقوش نظر آتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ قیام پاکستان کے بعد ایک جہان تازہ، غلاموں اور محکوموں کے لئے آزادیوں کا جام جہان آفریں لئے پیدا ہو رہا ہے۔

جہان نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

قیام پاکستان کے بعد، آزادی کی نعمت سے بہرہ یاب ہونے والے ممالک: *

سن	تاریخ	ملک	سن	تاریخ	ملک
۱۹۴۷ء	۱۴ اگست	پاکستان	۱۹۴۷ء	۱۵ اگست	بھارت
۱۹۴۸ء	۴ جنوری	برما	۱۹۴۸ء		سری لنکا

* ان تفصیلات کے لئے ہم محترم پروفیسر محمد بشیر احمد صاحب کے شکر گزار ہیں۔

۱۹۳۸ء	اگست	جنوبی کوریا	۱۹۴۷ء	ستمبر	شمالی کوریا
۱۹۴۹ء	یکم اکتوبر	چین	۱۹۴۹ء	دسمبر	انڈونیشیا
۱۹۵۱ء	۲۴ دسمبر	لیبیا	۱۹۵۳ء		لاؤس
۱۹۵۳ء	۹ نومبر	کمبوچیا	۱۹۵۶ء	یکم جنوری	سوڈان
۱۹۵۶ء		تیونس	۱۹۵۶ء		مراکش
۱۹۵۶ء		ویت نام	۱۹۵۷ء		ملائیشیا
۱۹۵۷ء	۶ مارچ	گھانا	۱۹۵۸ء	(سابقہ اپر وولٹا)	برکینا فاسو
۱۹۵۸ء	۱۱ اکتوبر	گنی	۱۹۶۰ء		قبرص
۱۹۶۰ء		مڈغاسکر	〃		ٹوگو
〃		نائیجیریا	〃	〃	چاڈ
〃		آئیوری کوسٹ	〃		مالی
〃	۳۰ جون	زائر	۱۹۶۰ء	جولائی	صومالیہ
〃	یکم اگست	دہومی	〃	۳ اگست	نائیجر
〃	۱۳ اگست	سنٹرل افریکن ری پبلک	〃	۱۵ اگست	جمہوریہ کانگو
〃	۱۷ اگست	گیبون	〃	۲۰ اگست	سینیگال
〃	۲۸ نومبر	ماریطانیا	۱۹۶۱ء	فروری	کویت
۱۹۶۱ء	۲۷ اپریل	سیرالیون	〃	ستمبر	روانڈا
۱۹۶۲ء		ویسٹرن سموآ	۱۹۶۲ء	۳ جولائی	الجزائر
〃	۱۹ اکتوبر	یوگنڈا	۱۹۶۳ء	۱۴ اکتوبر	جنوبی یمن
۱۹۶۳ء	۱۲ دسمبر	کینیا	〃		زمبابوے
۱۹۶۴ء	اپریل	ٹنزانیہ	۱۹۶۴ء	۴ جولائی	ملاوی
〃	۲۴ اکتوبر	زیمبیا	۱۹۶۵ء		گمبیا
۱۹۶۵ء		مالدیو	〃		سنگاپور
۱۹۶۶ء		بسوتھو	۱۹۶۶ء	۳۰ ستمبر	بوٹسوانا
〃	۴ اکتوبر	لیسوتھو	۱۹۶۸ء	۳۱ جنوری	نورو

۱۹۶۸ء	۱۲ مارچ	ماریشس	۱۹۶۸ء	۱۲ اکتوبر	استوائی گنی
۱۹۷۰ء	جون	ٹونگا	۱۹۷۰ء	۱۰ اکتوبر	فجی
۱۹۷۱ء		متحدہ عرب امارات	۱۹۷۱ء		بحرین
"		قطر	۱۹۷۲ء		کیمرون
۱۹۷۴ء		گنی بساؤ	۱۹۷۵ء		انگولا
۱۹۷۵ء	۲۵ جون	موزنبیق	"		کومورو
			"	۵ جولائی	کیپ ورڈے
۱۹۷۵ء	۱۶ ستمبر	پاپوانیوگنی	۱۹۷۶ء		سیشیلز
۱۹۷۸ء		جزائر سلیمان	۱۹۷۸ء	(سابقہ جزائر ایلاس)	توو الو
۱۹۷۹ء	(جزائر گلبرٹ)	کیریباتی	۱۹۸۰ء		وینواتو
۱۹۸۱ء		جبوتی	۱۹۸۴ء	۲۳ فروری	برونائی

قارئین کرام! غور فرمائیے کہ مسلمانانِ ہند کی ان آرزؤں کے صدقے کہ بار الٰہا اگر تو ہماری جدوجہد آزادی کو شرفِ پذیرائی بخش دے تو ہم تیرا تختِ اجلال بچھا دیں گے اور تیرے عطا فرمودہ نظامِ حیات القرآن الکریم کو اپنی اس مملکت کا ضابطۂ قانون بنائیں گے۔ اس خدائے رحیم و غفور کی صفتِ رحمت و عطا اس طرح جوش میں آجاتی ہے کہ نہ صرف مانگنے والوں کی دعائیں پوری ہوتی ہیں بلکہ اس مملکت کے قیام کے ساتھ ساتھ متعدد محکوم اقوام کی گردنوں سے غلامی کے طوق اتر جاتے ہیں اور انہیں انسانوں کی طرح زندہ رہنے کا حق مل جاتا ہے۔

اگر صرف، ہماری اس خواہش و آرزو سے کہ ہم آزاد مملکت حاصل کرنے کے بعد اس میں تیرے پسندیدہ نظامِ حیات الاسلام (وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ..... ۵:۳) کو اپنی حیاتِ ارضی کیلئے ضابطۂ ہدایت و رہنمائی بنائیں گے، وہ ربِ کریم اپنی کرم باریوں کو دنیائے انسانیت پر یوں ارزاں فرماتا ہے تو سوچئے (اور یہ مقام آپ کی گہری سوچ کا مرکز بننا چاہیے) کہ اگر ہم فی الواقع اقتدار کے حقیقی مالک سے کیا ہوا وعدہ پورا کر کے ہی اس آزاد مملکت میں اس کے عطا کردہ قانون کو نافذ کر دیں (جس کیلئے ہمارے راستے میں سوائے ملّا کے کوئی رکاوٹ نہیں) تو وہ اپنے لامحدود خزانوں سے ہمیں کتنی اور نعمتوں سے نواز دے۔

اس نے کہا کہ اگر تم ایسا کرو گے تو ہم تمہیں ایسی جنت ارضی عطا کریں گے جس میں:-

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ۝ ۴۱/۳۱

سب کچھ ہوگا جسے تمہارا جی چاہے گا اور وہ سب کچھ ملے گا جسے تم طلب کرو گے۔

اتنا ہی نہیں بلکہ: لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ ۝ (۵۰/۳۵)
ان کیلئے اس میں وہ سب کچھ ہوگا جسکی وہ آرزو کریں گے اور ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ ہے۔

اس آیۂ جلیلہ میں جہاں یہ کہا گیا ہے کہ اس جنت میں وہ سب کچھ ہوگا جسے وہ چاہیں گے، وہاں 'ولدینا مزید' کا ٹکڑا انتہائی غور کے قابل ہے۔ یعنی ایسا نہیں کہ ہمارے خزانے تمہاری خواہشات کو پورا کرنے میں ختم ہو جائیں گے بلکہ ہمارے پاس اتنا زیادہ ہے کہ تم جو کچھ بھی مانگ سکو، اسے دینے کے بعد ان میں کوئی کمی نہیں آتی۔ جو کچھ ہمارے پاس تمہیں دینے کے لئے ہے، اس کا موجودہ شعور کی سطح پر تم اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔

سوچئے اور فیصلہ کیجئے کہ کیا ہمارا ایفائے عہد، ہمارے لئے اس مملکت کو جنت نہیں بنا دے گا؟ ایسی جنت، جس کے متعلق وہ کہتا ہے کہ تم ہمارے عطا کردہ نظام کو نافذ تو کر کے دیکھو، اس کا نقشہ کیا بن جاتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ ایسا کرو گے تو صورت یہ ہو گی کہ:۔

وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا ..... ۝ (۳۹/۶۹)
یہ زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔

اور یہ دنیا اتنی حسین و جمیل اور خوش آیند ہو جائے گی کہ ہم بھی اپنے تمام ملائکہ سمیت اس میں اتر آئیں گے

وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ (۸۹/۲۲)

قارئین گرامی، ربِ ذوالمنن کے، دلوں کو خوش کر دینے والے اور سکینت اور طمانیت کی برکتیں عطا کرنے والے، ان وعدوں سے مسرت و اطمینان کے جھولے جھولنے کے بعد، ذرا دوسرے رُخ پر بھی نگاہ ڈالتے جایئے کہ یہ بھی اتنا ہی اہم ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے انسانیت کو سامانِ پرورش دینے کی ذمہ داری اپنے اُوپر لے رکھی ہے:۔

كَتَبَ اللَّهُ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ..... (۶/۱۲)
اور
كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (۶/۵۴)

لیکن یاد رکھو! تمہارے جن ارادوں اور وعدوں کی بنا پر ہم نے تمہیں یہ سب نعمتیں دے رکھی ہیں، اگر تم نے انہیں پورا نہ کیا تو ہمارا یہ وعدہ بھی ہے کہ:۔

وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم ۝ (۴۷/۳۸)
اگر تم روگردانی کرو گے تو اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئیگا پھر وہ تمہارے جیسے (عہد فراموش اور

احسان ناشناس) نہیں ہوں گے۔

اور ان دونوں صورتوں کے متعلق (عطاءِ رب اور ہمارے عدم ایفائے عہد کے متعلق) یہ کہہ دیا کہ:

إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ٥ (۳/۹)

کہ وہ اپنے کئے ہوئے وعدوں کی کبھی خلاف ورزی نہیں کرتا یعنی انہیں ہمیشہ پورا کرتا ہے۔

اس کے بعد سوچئے اور فیصلہ کیجئے کہ ہمیں اپنے آپ کو خدائے ذوالجلال والاکرام کے کس قسم کے انداز و بشارت کا مستحق بنانا ہے کیونکہ اللہ تبارک تعالیٰ نے جہاں ہمیں اس کی مکمل آزادی دی ہے کہ:

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ... (۴۱/۴۰)

جو چاہو کرو!

وہیں یہ بھی بتا دیا ہے کہ جو کچھ تم کرو گے، نتیجہ بھی اُسی کا نکلے گا۔ اس کا قانونِ مکافاتِ عمل اپنا وقفۂ مہلت پورا کرنے کے بعد اپنی پوری قدرتوں کے ساتھ اپنا فیصلہ نافذ کر دیتا ہے۔

إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ٥ إِنَّهُ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيدُ ٥ (۸۵/۱۲-۱۳)

تیرے رب کے قانونِ مکافات کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔ وہ (تیرا رب) ہر شے کو اُسکے نقطۂ آغاز سے پیدا کرتا اور اسے گردشیں دیتا ہوا مختلف ارتقائی مراحل میں سے گزار کر نقطۂ تکمیل تک پہنچا دیتا ہے۔

اور جب اس کا قانونِ مکافات اپنی گرفت (بطشِ شدید) کرتا ہے، تو اس روئے زمین پر تم اپنے بچاؤ کے خلاف، کوئی حامی و ناصر نہیں پاؤ گے۔

وَلَا يَجِدُونَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ٥ (۳۳/۱۷)

ہماری آرزو ہے کہ قوم کی سمجھ میں یہ بات آجائے اور ہم ایفائے عہد کرتے ہوئے، اپنی اس آزاد مملکت میں قرآنی احکام و اصول کی حکمرانی قائم کرکے اللہ کی مزید نعمتوں کے مستحق بن سکیں (اس سے ہرگز ہرگز مُلّا کی خود ساختہ شریعت مراد نہیں)۔ ... نہ کہ مسلسل عہد فراموشی اور رُوگردانی سے اس کے عذاب کے سزاوار ٹھہریں۔

اس حاکمِ اعلیٰ کے اقتدار کی سرحدیں اس قدر وسعت پذیر ہیں کہ کوئی ان سے باہر نہیں جا سکتا کہ نقل مکانی کرکے اس کی گرفت سے بچ جائے۔

اور نہ ہی اسکے لئے ہمارے پاس تا ابد کا وقت ہے۔ وقفۂ مہلت کی میعاد سے کوئی واقف نہیں۔ کون جانے اس میں کچھ وقت ہے یا یہ پورا ہونے کو ہے۔ ہمیں اس کا فیصلہ جلد کرنا ہوگا۔

محمد سرداز

وحیٔ خداوندی

(مَآ اَنزَلَ اللّٰہُ)

قرآن کریم کا ارشاد ہے :-

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ ۵/۴۴

"جو لوگ اپنی زندگی کے معاملات میں خدا کی طرف سے نازل کردہ (مَآ اَنْزَلَ اللّٰہ) کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، تو یہی لوگ تو کافر ہیں"

لہٰذا یہ بات مسلّم ہوگئی کہ "مسلمان" کی زندگی گذارنے کے لیۓ ما انزل اللہ ہی کو اپنی زندگی میں "حکم" بنانا ہوگا اسی لیۓ حضور نبی اکرمؐ سے ارشاد ربانی ہے :-

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ مِنَ الْکِتٰبِ وَمُھَیْمِنًا عَلَیْہِ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ ۵/۴۸

"ہم نے (اے رسول!) آپ کی طرف یہ کتاب نازل کی ہے جو تمام ٹھوس حقیقتوں کو اپنے آغوش میں رکھتی ہے۔ ان تمام وعدوں اور دعووں کو سچ کرکے دکھانے والی ہے جو کتب سابقہ میں کیۓ گئے تھے اور اس اصولی تعلیم کی جامع اور نگران و نگہبان ہے جو اس سے پہلے وقتاً فوقتاً دی جاتی رہی (اور جس کا ہمیشہ کے لیۓ غیر متبدل رکھنا مقصود ہے۔)

لہٰذا اب آپ لوگوں کے معاملات کے فیصلے اسی کتاب کے مطابق کریں"

ملاحظہ فرمایئے کہ کس وضاحت سے اللہ تبارک تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ جس ما انزل اللہ کے مطابق تمہیں اپنی زندگی کے فیصلے کرنے ہیں، وہ ہماری نازل کردہ "الکتٰب" ہے۔

یعنی یہ امر شک و شبہ کی ہر رمق سے پاک، طے پاگیا کہ وحی (ما انزل اللہ) جس کے اتباع کا ہمیں حکم دیا گیا ہے، وہ، وہی الکتٰب ہے۔ جو حضورؐ پر نازل ہوئی۔

اور اب اسے خود حضور نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے سنئے کہ آپؐ پر کون سی الکتٰب نازل ہوئی تھی؟

قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَھَادَۃً ؕ قُلِ اللّٰہُ ۙ شَھِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَبَیْنَکُمْ ۚ وَاُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا

اَلْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶/۱۹

" ان سے پوچھو کہ کس کی شہادت سب سے بڑی ہو سکتی ہے؟ میرے اور تمہارے درمیان خود خدا کی شہادت موجود ہے کہ یہ قرآن مجھ پر وحی کیا گیا ہے تاکہ میں، اس کے ذریعے تمہیں اور انہیں بھی، جن تک یہ بعد میں پہنچے، زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دوں۔"

اور اس انذرکم بہٖ کی یوں تشریح فرمائی۔

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۱/۴۵

" ان سے کہہ دیجئے کہ میں تمہیں وحی کے ذریعے، تمہاری زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتا ہوں۔"

اب دیکھئے، قرآن کے نازل کرنے والے، اللہ جل شانہٗ نے اپنی وحی کے اپنی جانب سے نازل شدہ ہونے کی کیا کہہ کر دلیل قاطع اور برہان تامہ دی ہے؟

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۴/۸۲

" کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔ (یہ تدبر کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ) اگر یہ اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا۔ تو اس میں بے شمار اختلافات ہوتے۔ (جگہ جگہ تضادات ہوتے۔)"

لہٰذا وحیٔ خداوندی کی بنیادی شرط یہ ہوئی کہ اس میں کہیں کوئی اختلاف نہ ہو۔ کسی جگہ کوئی تضاد نہ ہو۔

اللہ تبارک تعالیٰ کے قائم فرمودہ، اپنی وحی کے ثبوت میں ، اس معیار پر صرف قرآن کریم پورا اترتا ہے۔ دنیا کی اور کوئی کتاب اس پر پوری نہیں اترتی۔ جو لوگ ، خارج از قرآن، وحیٔ خداوندی (مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ) کے قائل ہیں اور بالخصوص احادیث منسوب الی الرسولؐ کو وحیٔ خداوندی (مَا انزل اللّٰہ) قرار دینے والے، ان کتابوں کو ذرا اس معیار پر تو پرکھ کر دیکھ لیں۔

احادیث منسوب الی الرسول کو وحیٔ خداوندی (مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ) ماننے والے تو خود اس کے معترف ہیں کہ احادیث کی مختلف کتابوں کے اندر اور ایک ہی کتاب میں ایک موضوع پر آنے والی مختلف احادیث میں اختلافات موجود ہیں۔

" نہ صرف اختلافات، بلکہ یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ احادیث کی کتب میں، ضعیف احادیث بھی ہیں اور غیر صحیح بھی۔" (ماہنامہ محدث جلد ۱۸ عدد ۱۱ بابت ستمبر ۱۹۸۷ء صفحہ ۱۳-۱۴)

یہاں ہم ایک اور اہم نقطہ کی وضاحت بھی کرتے چلیں کہ حضورؐ نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں جو کچھ کیا اور قرآن کے علاوہ جو کچھ فرمایا، وہ وحیٔ خداوندی (قرآن کریم) کے اتباع میں تو ہے لیکن وحیٔ خداوندی نہیں۔ کیونکہ حضورؐ کا ارشادِ گرامی ہے:۔

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ .... ۝ (۵۰/۶ ، ۹/۴۶)

"جو کچھ مجھ پر اللہ کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے، میں اُسی کا اتباع کرتا ہوں"۔

چونکہ وحیِ خداوندی کو انسانیت کے لئے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے، ضابطۂ حیات اور رہنمائے سفرِ حیات بنا کر بھیجا گیا ہے، اس لئے اِسے ہونا بھی ایسا چاہیئے جس میں کوئی ابہام نہ ہو، کوئی اختلاف نہ ہو، جو مکمل ہو، غیر متبدل ہو اور انسانوں کی دستبرد سے محفوظ ہو۔ (یعنی انسان اس میں کوئی تبدیلی نہ کر سکے) یقینی ہو، الحق ہو۔ دیکھئے کس طرح قرآنِ کریم کے متعلق ذاتِ باری تعالیٰ، ان میں سے ایک ایک کی شہادت بہم پہنچاتے ہیں۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ ۵۰/۱۱۵

"اس قرآن میں خدا کا ضابطۂ قوانین، تمام صداقتوں کو اپنے اندر لئے اور عدل و توازن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے مکمل ہو گیا ہے۔ اب ان قوانینِ خداوندی میں کوئی تغیر و تبدل کرنے والا نہیں"۔

اور یہ اس لئے کہ اس قرآن کی حفاظت، اس خدا نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے جس کی بے پناہ اور حدود ناآشنا قوتوں کا اندازہ لگانا انسان کے بس کی بات ہی نہیں۔ دیکھئے۔ اللہ تعالیٰ کس ختم و یقین کے ساتھ ضمانت بہم پہنچاتے ہیں۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (۱۵/۹)

"بلاشبہ ہم ہی نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"۔

مزید برآں یہ بھی کہ :-

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ ۴۱/۵۳

"ہم انہیں خارجی کائنات اور ان کے اپنے اندر (انسانوں کی دنیا میں) اپنی آیات (نشانیاں) دکھلاتے جائیں گے تاآنکہ یہ حقیقت ان پر ثابت ہو جائے کہ یہ (قرآن) الحق ہے"۔

کیا انسانیت، کسی اور کتاب کے متعلق (کتبِ احادیث شمول)، خدا کی یہ یقین دہانیاں فراہم کر سکتی ہے؟ ہرگز ہرگز نہیں۔ انسانیت تو آج تک، قرآنِ کریم کے اس چیلنج کا جواب بھی نہیں دے سکی۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَاۗءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ ۲/۲۳، نیز ۱۰/۳۸

"جو کچھ ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے۔ اگر تمہیں اس کے متعلق شک ہے (کہ وہ خدا کی طرف سے نہیں)، تو تم اس کی مثل ایک سورۃ بنا کر لے آؤ اور، خدا کو چھوڑ کر جنہیں بھی اپنے ساتھ بلانا چاہو بلا لو۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ایسا کر کے دکھاؤ"۔

اور جس چیز کے متعلق، مالکِ ارض و سما کی ایسی یقین دہانیاں میسر نہ آسکتی ہوں، وہ ظنی ہے، انسانوں کا قیاس

ہے اور ہرگز ہرگز انسانیت کی رہنمائی کا منشور نہیں بن سکتی کیونکہ :۔

اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ۵۳/۲۸

"بے شک ظن (و قیاس)، حق (و یقین) کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتا اور نہ ہی وہ کام دے سکتا ہے جو یقینی علم دیتا ہے"

اسی کے پیش نظر اقبالؒ نے کہا ہے کہ :۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اور سب سے آخر میں، حضور نبی اکرمؐ، ہمارے ہادیٔ برحق کا اپنے آخری خطبہ حجۃ الوداع میں عطا فرمودہ یہ منشور کہ :۔

وانی قد ترکت فیکم مالن تضلوا بعدہ ان اعتصمتم بہ کتاب اللہ۔

(معراج انسانیت از محترم پرویزؒ صاحب ص۴۱۳) سیرت النبی از علامہ شبلی نعمانی مرحوم حصہ دوم)

ذرا غور فرمائیے اس حقیقت پر بھی کہ یہ صرف قرآن کریم ہے جس کو چھوڑ دینا، بارگاہِ خداوندی میں، اتنا بڑا جرم ہے کہ خدا کا رسولؐ، اپنے پروردگار سے یہ شکایت کرے گا کہ :۔

وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا ۝ ۳۰/۲۵

"اور رسول نے کہا کہ اے میرے پروردگار بے شک میری اس قوم نے قرآن کو مہجور رکھا (چھوڑا ہوا تھا)"

صدرِ اول کے مسلمان، اپنی ہم عصر اقوام میں، بام عروج اور فضیلت کی بلندیوں پر، تمسک بالقرآن ہی سے پہنچے تھے، اور ہم آج، قرآن ہی کو پس پشت ڈالنے کی وجہ سے ذلیل و زبوں حال ہیں۔

وہ زمانے میں معزز تھے، مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر (اقبالؒ)

اسے زمانے میں، محسنِ انسانیت حضور نبی اکرمؐ کے اتباع میں، سب سے پہلے، سر سید احمد خانؒ
عت الی القرآن" کی آواز بلند کی۔ اسی کو علامہ اقبالؒ تمام عمر باآہنگِ بلند دہراتے رہے اور
کی ہم نوائی میں محترم پرویزؒ صاحب قوم سے یہ کہتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے کہ
کی بازیابی کی صرف اور صرف ایک صورت ہے اور وہ ہے قرآن خالص کو اپنی حیات کا رہنما اور
اس کے علاوہ اس کی کوئی اور شکل نہیں۔

ویزؒ صاحب کے اسی پیغام اور اس پیغام کو بنی نوع انسان تک پہنچانے کی مساعی
دوام دینے کے لیے طلوعِ اسلام ٹرسٹ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ اللہ جل شانہ

...لیسٹ کی ان مساعی کو د جو اُسی کی کتاب عظیم کو اس کی اصلی اور نکھری صورت میں دنیا کے سامنے
... کے لیے وقف ہیں، شرفِ قبولیت بخشیں اور ہم اپنی آنکھوں سے اس کا یہ وعدہ پورا ہوتا دیکھیں کہ؛

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا ۳۹/۶۹

اور زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔

...تنقید و نظر از صفحہ ۵۸

ہم ایسی کُل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں۔

...ہمیں معلوم نہیں حضرت علامہ مفتی صاحب کے بیٹے یہ کتاب پڑھ کر ان کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں
...ن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کتاب لکھ کر مفتی صاحب نے صرف متاعِ دنیا کو سامنے رکھا ہے توشۂ آخرت کی فکر نہیں
...۔ اللہ ہم سب کو دین کو صحیح سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین

...دنیا کے مشکل ترین مسئلہ — تقدیر — کا قابلِ فہم اور بصیرت افروز حل

قرآن کریم کی روشنی میں
کتاب التقدیر
محترم پرویز صاحب کی کتاب

قیمت ۴۰/- روپے
(علاوہ محصول ڈاک)

تصورِ پاکستان

اور

عالمانِ زنّار پوش سے اظہارِ عقیدت

طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۸۸ء میں لکھا گیا تھا کہ آنجہانی مسٹر گاندھی کے متحدہ قومیت" کے خواب کو، جو علامہ اقبالؒ کی تعلیمات اور قائداعظم اور ان کے رفقائے محترم پرویز صاحب کی مساعی سے شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، کس طرح آج پھر پاکستان میں، عالمانِ زنّار پوش کی برسیاں منانے کی شکل میں اُن کے عقیدتمندوں کی طرف سے تحریکِ حصولِ پاکستان کے دوران ان کے پاکستان دشمن کرداروں کو خالص اسلامی لباس پہنانے کی کوششوں کی صورت میں زندہ کرنے کی مذموم سازشیں کی جا رہی ہیں۔

انہی سازشوں میں ہندوستان کے فلمی فنکاروں آنجہانی مسٹر گاندھی کی پوتی وغیرہ کے خیر سگالی کے دورے بھی شامل ہیں۔ جن کے دوران ہمارے زعماء کی طرف سے جس فراخدلی اور عزّت افزائی کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے اور جنہیں دیکھ دیکھ کر ہماری اور ہر بہی خواہِ پاکستان کی نظریں شرم سے زمین میں گڑی جاتی ہیں۔ اور بے اختیار یہ کلمات زبان پر آجاتے ہیں کہ خدایا ہمارے رہنماؤں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ دوست دشمن کی پہچان سے بھی عاری ہو گئے ہیں۔ ان دوروں کے دوران اور ان کے اختتام پر، خیر سگالی کے مزعومہ جذبات لے کر پاکستان آنے والے یہ لوگ جو بیانات دے جاتے ہیں۔ طلوعِ اسلام بابت مئی ۱۹۸۸ء کے لمعات میں ان پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اسی سلسلہ کی تازہ ترین کڑی، معروف ہندوستانی فلمی شخصیت دلیپ کمار (جن کا اصلی نام ہے محمد یوسف خان ہے) کا وہ بیان بھی ہے جس میں انہوں نے پاکستان اور ہندوستان میں کنفیڈریشن قائم کرنے کی دعوت دی اور بعد میں نہایت چالاکی سے تردید کر دی۔ تردید کرنے سے کیا ہوتا ہے، وہ اپنے دل کی بات تو کہہ ہی گئے اور ہمارے قومی اخبارات کی وساطت سے ان کا یہ پیغام پاکستانیوں تک پہنچ ہی گیا۔

اس سلسلہ میں، طلوعِ اسلام کی پرانی فائلوں میں سے، چوہدری حبیب احمد مرحوم (فیصل آباد) کا وہ

مضمون پیشِ خدمت قارئین کیا جا رہا ہے جو طلوع اسلام بابت نومبر ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تھا اور جس کا عنوان تھا "تصورِ پاکستان اور عالمانِ زنّار پوش سے اظہارِ عقیدت"۔ چوہدری حبیب احمد صاحب مرحوم تحریک پاکستان کے آغاز ہی سے جو اس کے ساتھ وابستہ ہوئے تو عمر کے آخری سانس تک" وفاداری بشرطِ استواری" کی مثال قائم کرتے ہوئے، اس سے بدل وجان وابستہ رہے۔ تحریک پاکستان ان کا خاص موضوع تھا اور ان کی دو تصانیف" تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علما "اور" علامہ اقبال"، قائداعظم، پرویز، مودودی اور تحریک پاکستان" اس موضوع پر بلاشبہ انسائیکلوپیڈیا کہلانے کی مستحق ہیں۔ کہ ان میں انہوں نے تاریخِ تحریکِ حصولِ پاکستان سے متعلق معلومات کا خزانہ جمع کر دیا ہے۔

اس مضمون سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ متحدہ قومیت کے علمبرداروں کی آج نظا ہر تازہ کوشش "تازہ نہیں ہے بلکہ یہ وہی شرابِ کہن ہے جسے مسلمانانِ ہند نے" آنجہانی مسٹر گاندھی اور ان کے پیروکاروں (جن میں بڑے بڑے پردہ داروں کے نام بھی آتے ہیں) کے ہاتھوں نوش کرنے سے انکار کرتے ہوئے" اپنے اس رہنما کا ساتھ دیا جو بانیٔ پاکستان اور بابائے قوم بننے کی سعادت سے بہرہ یاب ہوا، اور جس کی انتھک مساعی اور جدوجہد (جن میں اس کا خونِ جگر بھی شامل ہے) سے مملکتِ خداداد پاکستان وجود پذیر ہوئی۔ اور ہمارا شمار دنیا کی آزاد اقوام میں ہونے لگا۔ اس وقت ہم اپنے ان عظیم رہنماؤں کی مخلص کوششوں سے جس زہر کو پینے سے بچ گئے آج پھر ہر طرف سے یورشیں ہو رہی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح ہمارے حلق سے نیچے اتر جائے اور خاکم بدہن پاکستان کو پھر سے ہندوستان میں مدغم کر دیا جائے۔

اب آپ چوہدری صاحب (مرحوم) کا مذکورہ مضمون ملاحظہ فرمائیے:-

چوہدری حبیب احمد صاحب
(لائل پوری)

تصورِ پاکستان اور عالمانِ زنار پوش سے اظہارِ عقیدت

میرے لئے یہ امر باعثِ فخر بھی ہے اور موجبِ خطر بھی کہ میں طلوعِ اسلام کے لئے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھا رہا ہوں جو میرے لئے نیا تو نہیں، کہ اس کے متعلق میری ضخیم کتاب تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء منظرِ عام پر آ چکی ہے لیکن مفاہمت پرست دوستوں کی دنیا میں جہاں مسلمان توحید میں تو گرمجوش ہے مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش، کی حقیقت ناآشناؤں کی ناراضی کا موجب ضرور بنے گا۔ موجبِ خطر اس لئے بھی کہتا ہوں کہ جب محترم علاؤ الدین صدیقی صاحب جیسوں نے (مولانا) ابوالکلام آزاد مرحوم کو 'جو آبِ کوثر سے پھسل کر لبِ گنگا پہنچے اور وہاں سے لوٹنے کی خبر آج تک نہیں آئی' رحمتہ اللہ علیہ کہہ دیا، تو عام ذہنوں تک حقیقت کا پہنچانا کس قدر مشکل ہوگا۔ میرے لئے یہ عقل کا پیدا کردہ الجھاؤ ہے لیکن جنونِ باشعور ادائیگیِ فرض کے لئے مجبور کر رہا ہے اور بار بار کہہ رہا ہے کہ ؎

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

یہی ہے اس جراَتِ بیباک کا جذبۂ محرک۔

۸ ستمبر کو پی۔ این۔ آر میں پاکستان کلچرل کونسل کے زیرِ اہتمام قائد اعظمؒ کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے ایک جلسہ ہوا تھا جس کی صدارت وزیرِ داخلہ جناب قاضی فضل اللہ نے کی۔ اس میں جناب ...کاظم رضوی اور سید نذیر عالم صاحب کے علاوہ مولانا علاؤ الدین صدیقی اور جناب پرویز نے "...پاکستان" کے موضوع پر تقاریر ارشاد فرمائیں۔ ان دو موخر الذکر اصحاب کے احساسات و خیالات ...ات و رسائل نے اپنے اپنے انداز میں پیش کیا اور اپنے اپنے مطلب کی حاشیہ آرائی کی ہے

...میں جہاں صرف صفحہ درج ہوگا وہ "تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" کا ہوگا۔

میں بھی حاضر تھا وہاں۔ اس لئے بھی اور تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء کے مؤلف کی حیثیت سے بھی مجھ پر یہ فریضہ عاید ہوتا ہے کہ معرکۂ دین و وطن کی حقیقی روح کو سامنے لاؤں۔

میں نے اس خیال سے کہ پرویز صاحب کی تقریر طلوعِ اسلام میں شائع ہو جائے گی، ان کے پیش کردہ اقتباسات درج کرنے مناسب نہیں سمجھے۔ صرف دو ایک مزید اقتباسات درج کر کے گفتگو کو آگے بڑھا رہا ہوں۔

مسلم یونیورسٹی قائداعظمؒ نے ۵ فروری ۱۹۳۸ء کو مسلم یونیورسٹی میں ایک پیغامِ ملّی میں فرمایا:۔

> لیگ نے مسلمانوں کو ان کے رجعت پسند عناصر سے رہائی دلوائی ہے اور ایسی رائے تخلیق کر دی ہے کہ وہ لوگ جو خود غرضی سے اپنی ذاتی اغراض کے پیچھے پڑے ہوتے تھے قوی غدار ہیں۔ لیگ نے آپ کو مولویوں اور مُلّاؤں کے ناکارہ عناصر سے بھی رہا کرا دیا ہے۔ میں مولوی کی جانب من حیثیت الجماعت اشارہ نہیں کر رہا ان میں بعض مخلص ہیں مگر ان کا ایک طبقہ بُرا ہے۔ میں نوجوانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ برطانوی حکومت، کانگرس، رجعت پسند مسلمان اور مولوی و مُلّا ان چاروں سے رہائی پانے کے بعد اب آپ فرقۂ اناث کو قید و بند سے چھڑائیں۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ ہم اہلِ مغرب کی نقالی کریں اور بیہودگیاں اور خرابیاں اختیار کریں، ہرگز نہیں میرا مقصد یہ ہے کہ ہماری مستورات ہماری زندگی میں نہ صرف معاشرتی بلکہ سیاسی لحاظ سے بھی حصہ لیں۔ (صفحہ ۱۶۷)

مشاہی دربار بلوچستان میں ۱۴ فروری ۱۹۴۸ء کو ایک تقریر ارشاد فرمائی جس میں کہا کہ:۔ "میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس اُسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے جو ہمیں قانون عطا کرنے والے پیغمبرِ اسلام نے ہمارے لئے بنایا ہے۔"

(صفحہ ۱۷۳، ۱۷۴)

جناب پرویز نے "تصورِ پاکستان" کے ضمن میں قائداعظمؒ کے فرمودات کے جتنے اقتباسات پیش کئے، ان سے ثابت کیا تھا کہ قائداعظمؒ پاکستان میں ایسا معاشرہ تشکیل کرنے کے آرزومند تھے جو معاشرۂ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ نے قائم کیا تھا۔ انہوں نے یہ بات بڑے واضح الفاظ میں کہی تھی۔

محترم پرویز صاحب کے بعد اسلامی مشاورتی کونسل کے صدر جناب علاؤ الدین صدیقی نے تقریر

... تقریر میں آپ نے بار بار رضوی و پرویز کے خیالات سے کلی اتفاق کا اظہار اور ان کے خیالات و کلمات کی ... تائید کی۔ لیکن بعد میں اقتباس مت پیش کر کے وہ دفعتاً اس طرح گویا ہوتے کہ میں نے مسجد شاہ چراغ ... میں آٹھ خطبے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے لٹریچر سے مرتب کر کے دیئے تھے جن سے یہ ... ثابت کیا تھا کہ وہ (مولانا آزاد) بھی پاکستان کے حامی تھے۔ میں پہلی صف میں بیٹھا تھا۔ صدیقی صاحب سے اٹھائیس تیس سال مراسم ہیں میں نے بصد حیرت مستفسرانہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا تو فوراً پلٹ کر کہنے لگے۔ مولانا مدنی کے متعلق اقبالؒ کی جو رباعی ہے اسے تو آپ سب جانتے ہی ہیں۔ لیکن ... موقعہ پر علامہ صدیقی نے ایک شعر تک نہ پڑھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شرما سے گئے ہوں۔ پھر انہوں نے چند علماء کے نام لئے جنہوں نے تحریک قیام پاکستان میں حصہ لیا تھا۔ اور رُخ بدل کر فرمانے لگے کہ چند علماء کی کوتاہی سے سب علماء کو مطعون تو نہیں کیا جا سکتا۔

پرویز صاحب نے اپنی تقریر میں حضرت قائداعظمؒ کی تقریر کا وہ اقتباس بھی پیش کیا تھا جہاں انہوں نے فرمایا تھا کہ پاکستان میں تھیا کریسی (مذہبی پیشوائیت) کی حکومت نہیں ہوگی، اسلام کی حکومت ہوگی۔

صدیقی صاحب نے اپنی تقریر میں زیادہ تر زور اسی پر دیا کہ علماء ہی حامل دین متین ہیں۔ آپ نے سامعین کو یہ تأثر دینے کے لئے کہ پرویز حضورؐ کی وساطت کے بغیر ہی قرآن کا نظام حیات پاکستان میں نافذ کرنا چاہتا ہے، اپنے خاص لہجہ میں اسی رباعی کا ایک شعر جسے مدنی مرحوم کے ضمن میں پڑھنے سے وہ رک گئے تھے، پڑھا ؎

بمصطفٰی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

یہ ظاہر ہے کہ اقبالؒ و جناحؒ کی طرح پرویز مذہبی پیشوائیت کے قائل نہیں ہیں۔ انہوں نے حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی وفات کے بعد نیشنلسٹ علماء کے اعتراضات کے جوابات دینے کے ... معاذیر طلوع اسلام میں بہت کچھ لکھا۔ اور ان کے علم کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیر کر رکھ دی ... تھیں۔ ابوالکلام و مدنی (مرحومین) کو مذہبی رہنما تسلیم کرنے والے ان سے ذہنی انتقام لینے کے لئے ... وقتاً فوقتاً ان کو غلط رنگ میں پیش کر کے شکست خوردہ ماضی کو تسلی و تسکین دینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ میں اس طرف تو بعد میں آؤں گا پہلے پرویز صاحب کی تحریروں کے چند اقتباسات پیش ... کروں گا کہ انہیں حضور اقدس و اعظم ختمی مرتبت (فداہ ابی و امی) سے کس قدر عشق ہے۔ میرے نزدیک

اس کا اندازہ کوئی عاشق رسولؐ ہی عشق کے پیمانوں سے کرسکتا ہے۔ یہ اتہامات باندھنے اور الزامات لگانیوالے ان کی اس کیفیتِ قلبی کا کیا اندازہ کر سکیں گے۔ ملاحظہ فرمائیں :۔

امریکہ کا دریدہ دہن اخبار امریکہ کے ایک دریدہ دہن اخبار نے حضورؐ ختمی مرتبت سرورِ کائنات علیہ التحیۃ والصلوٰۃ کی ذاتِ اقدس کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال کئے تھے جس کے خلاف سر عبدالحلیم غزنوی صاحب نے اسمبلی میں تحریکِ التوا پیش کی تھی۔ ۷ رنومبر ۱۹۴۱ء کے طلوعِ اسلام کے صفحہ ۵۱، ۵۲ پر پرویز صاحب لکھتے ہیں :۔

"دنیا کو شاید معلوم نہیں کہ ایک مسلمان کے نزدیک جس کے دل میں ایمان کی کوئی کرن موجود ہے حضورِ سرورِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی قدر و منزلت کیا ہے! وہ ذاتِ گرامی (فداہ ابی وامی) جن پر ایمان ہمارے لئے باعثِ نجات وسعادت اور جن کی محبت سرمایۂ زندگی و متاعِ حیات ہے ہمارے نزدیک معراجِ انسانیت کا مظہرِ اتم اور دنیا و آخرت کی بلند ترین سرفرازیوں کا پیکرِ مقدس ہے۔ اس ذاتِ فخرِ موجودات کی شان میں نازیبا الفاظ تو کجا' ہم تو ان کوچوں اور گلیوں کی توہین بھی برداشت نہیں کر سکتے جن کے ذرات کو اس پیکرِ رفعت و عظمت کی کفش بوسی کی سعادت نصیب ہوگئی۔ خوشا بخت ہیں وہ راہیں جن میں وہ شمعِ فروزاں ضیا بار و جلوہ ریز ہوتی۔ اور زہے نصیب خاک کے ان ذروں کے جوان درخشندہ و تابناک نقوشِ قدم کے چومنے سے آسمان کی بلندیوں پر پہنچ گئے۔

دنیا کیا جانے کہ اس پیکرِ محبوبیت کے ساتھ ہمارے قلوب کا کیا رشتہ ہے۔ ایک زندگی کیا' ہزار بار زندگی نصیب ہو اور ہزار بار اس شہنشاہِ کونین کی ناموس پر نچھاور ہو جائے تو پھر بھی دل کی تمنا بر نہ آئے۔ جس سینے میں عشقِ رسولؐ کا سوز نہیں وہ سینہ نہیں' بدبختیوں اور نامرادیوں کا قبرستان ہے۔ جس دل میں ناموسِ محمدؐ پر مر مٹنے کی تمنا نہیں وہ دل نہیں' بوم و کرگس کا وحشت انگیز کاشانہ ہے!

لیکن غلام کا عشق کیسا اور محکوم کی تمنا کیسی؟

تحفظِ ناموسِ رسولؐ گداگری کے اجتماعات سے نہیں ہو سکتا' جماعت کی قوت سے ہو سکتا ہے۔ وہ قوت جس کے ضعف کا باعث خود جناب عبدالحلیم غزنوی ہے۔ ہم اپنے بھائی سے ناموسِ رسالت کے نام پر اپیل کریں گے کہ وہ اپنی انفرادی روش کو چھوڑ کر پھر سے جماعت میں آملیں اور یوں ملت کے بکھرے ہوئے ذروں کو ایک ایسی محکم چٹان بنا دیں' کہ

مخالفت و ناسا عدت کی جو موج اس سے ٹکراتی، پاش پاش ہو جاتی۔ اس دنیا میں [illegible]
کس کی ہمت پڑی تھی کہ وہ شہنشاہ کونین علیہ الصلوٰۃ والسلام تو کجا ، ان کے [illegible]
کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر دیکھ جائے۔ ؎

افرنگ ز خود بے خبرت کرد ، دگرنہ
اے بندۂ مومن تو بشیری تو نذیری

پرویز کے ازلی مخالفین بآسانی کہہ دیں گے کہ صاحب اُس دور میں وہ ایسے ہوں گے۔ اب تو اُن [illegible]
یکسر تبدیلی آ چکی ہے۔ قارئین کرام! پرویز، ابوالکلام نہیں کہ اسلام سے مایوسی و بیزاری کا اظہار [illegible]
دیں اور ہم بھی اُن ایسے نہیں جواب بھی "امام الہند" کو رحمۃ اللہ علیہ کہنے سے نہیں شرماتے۔
ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور نے ان کی ایک تقریر جو ۱۹۵۵ء میں "مقامِ محمدی" کے
عنوان سے کی تھی، نومبر ۱۹۷۶ء میں پمفلٹ کی صورت میں شائع کی ہے۔
سرورق پر "مقامِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم" اور اس کے نیچے ــــ

گرد او گردد حریمِ کائنات

لکھا ہے۔ اور تقریر کا آغاز ــــ

" ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ مے آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا "

سے کرتے ہیں۔ اس میں وہ کہتے ہیں۔ برادرانِ عزیز!

"آپ کو معلوم ہے کہ میری زندگی کا مشن پیامِ خداوندی کو عام کرنا ہے لیکن پیامِ خداوندی سمجھ میں نہیں آ سکتا تاوقتیکہ مقامِ محمدی نگاہوں کے سامنے نہ ہو۔"

اسی پمفلٹ کے صفحہ ۲۷ پر رقمطراز ہیں :۔

"آج کل ہم (مسلمانوں) میں جو کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ نبی کا کام صرف اس قدر ہے کہ وہ خدا کی طرف سے حاصل کردہ وحی کو دوسروں تک پہنچا دے اور بس۔ یعنی جب وہ پیامِ خداوندی کو دوسروں تک پہنچا دیتا ہے تو اس کے بعد اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اُن کے خیال کے مطابق یوں سمجھئے کہ نبی کی حیثیت (معاذ اللہ) ایک ڈاکیہ کی ہوتی ہے جس کا کام محض چٹھی پہنچا دینا ہوتا ہے اور بس۔"

[illegible]

نبی کا کام خدا سے وحی پاکر اسے انسانوں تک پہنچا دینا ہی نہیں ہوتا بلکہ وحی کی روشنی میں نظامِ خداوندی کا قیام بھی ہوتا ہے۔ اور یہ مقصد بہت بلند اور یہ فریضہ بڑا اہم ہوتا ہے نبوّت نبی اکرمؐ کے ساتھ ختم ہو گئی۔ لہذا حضورؐ کے بعد کوئی شخص خدا کی طرف سے وحی نہیں پا سکتا لیکن اس وحی کی روشنی میں نظامِ خداوندی کا قیام اور اس کے قیام کے بعد اس کا تسلسل و استحکام وہ فرائض ہیں جو حضورؐ کی تشریف براری کے بعد اُمت کے سپرد ہوئے۔

حضورؐ کے بعد بدقسمتی سے، یہ گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی اور نظامِ خداوندی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب اُمت کا کام یہ ہے کہ اتباعِ نبویؐ میں پھر سے اُسی نظام کو قائم کرے تاکہ خدا کا دین متمکن ہو جائے اور جنت سے نکلا ہوا آدم پھر سے فردوسِ گم گشتہ پالے۔

آگے چل کر کہتے ہیں:۔

یاد رکھیئے برادران! انسان جو جی میں آئے کر کے دیکھ لے۔ اس کی نجات و سعادت کی صرف ایک ہی راہ ہے۔ یعنی وہ راہ جو مقامِ محمدی (وحی) پر ایمان سے متعین ہوتی ہے۔ اور جس کی طرف پیامِ محمدی (قرآن) راہ نمائی کرتا ہے۔ ؎

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

یہ ہے حکیم الاُمت علامہ اقبالؒ کی مشہور و معروف اس رباعی کا شعر جس کو صدیقی صاحب مدنی مرحوم ذکر میں پڑھنے سے عمداً گریز کر گئے تھے۔ اور ان کی زبان پر نہ آئی لیکن اپنی تقریر میں یہ رنگ پیدا کرنے کے لئے کہ پرویز حضورؐ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے کو ضروری قرار نہیں دیتا، پڑھا تھا۔ میں نے پرویز کے لٹریچر میں یہ رباعی اُس وقت کئی ایک مقامات پر حوالے کے طور پر دیکھی جب میں اپنی کتاب کے لئے ان کے لٹریچر سے اقتباسات لے رہا تھا۔ محولہ بالا اقتباسات سے بات نکھر کر سامنے آ گئی ہے۔ مزید تسلی کرنے والے پرویز صاحب کی شہرہ آفاق کتاب "معراجِ انسانیت" کا مطالعہ کریں۔ اس سے اس جھوٹے پروپیگنڈے کا طلسم ٹوٹ جائے گا۔

اس شور و غوغا اور مخالفت و شورش میں یہ باریک نکتہ پنہاں ہے کہ پرویز بھی اقبالؒ و جناحؒ کی طرح 'دین' کی اجارہ داری مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں نہیں دیتے۔ قرآن کی روشنی میں نظامِ خداوندی کے قیام و نفاذ کی ذمہ داری اُمتِ محمدیہ کو سونپتے ہیں۔ چونکہ مذہبی اجارہ داروں کی مفاد پرستیاں خطرہ میں پڑ جاتی ہیں اس وجہ سے اجارہ دارانِ مذہب جب موقع ملتا ہے لوگوں کے جذبات پرویز کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔

پرویز کا جرم عظیم

پرویز صاحب نے جیساکہ ۱۰ ستمبر بی۔این۔آر کے جلسہ میں کہا تھا ۱۹۳۸ء میں طلوعِ اسلام کا اجراء علامہ اقبالؒ کے منشا کے مطابق نیشنلسٹ علماء کے نظریۂ پاکستان پر کئے جانے والے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے کیا گیا تھا۔ یہی ہے پرویز کا وہ جرم کبیرہ جس کی وجہ سے یہ حضرات ان کے خلاف شورشیں اٹھاتے اور ہنگامے بپا کرتے ہیں۔ مدنی مرحوم نے جب "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" کا اسلام سوز نعرہ لگایا تھا، اس وقت کی پرویز صاحب کی ایک تحریر ملاحظہ فرمائیں۔

> "جن خوش بخت حضرات کو علامہ کے قرب کی سعادت نصیب تھی، ان کا بیان ہے کہ انہوں نے (حضرت علامہ نے) جب اس بیان کو پڑھا تو وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے تھے اور کہتے تھے کہ یا الٰہ العالمین! اس ہندوستان میں تیرے اس پیغام ازلی کا کیا انجام ہونے والا ہے جہاں کے مفتیانِ دینِ متین اور حامیانِ شرعِ مبین کی یہ کیفیت ہے کہ وہ اس نظریہ کو اسلامی نظریہ قرار دے رہے ہیں جس باطل نظریہ کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا اور جب تک اسے عملاً فنا نہیں کر دیا گیا تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت کا اعلان نہیں ہوا۔ حضرت علامہ پر ان دنوں مرض الموت کے سخت دورے پڑ رہے تھے لیکن مسئلہ کی اہمیت ایسی تھی کہ انہوں نے جان تک کی پرواہ نہیں کی اور اس کے متعلق ایک نہایت بسیط اور جامع بیان اخبارات میں شائع فرمادیا اور یوں اس مسلسل جہاد کی تکمیل فرمادی جس کے اندر ان کی تمام زندگی صرف ہوئی تھی۔ وہ جواب اس قدر مسکت اور محکم تھا، کہ مولانا صاحب کو کہنا پڑا کہ "میرا مقصد دلی کے بیان میں اخبار تھا انشاء نہ تھا"۔"

مولانا مدنی نے حکیم الامت کی وفات کے بعد ان کے آخری بیان کی تردید میں ایک پمفلٹ بعنوان "متحدہ قومیت اور اسلام" شائع کیا تھا۔ اسمیں جو زبان استعمال کی گئی وہ کچھ پسندیدہ نہ تھی۔ اس میں افہام حقیقت سے زیادہ حضرت علامہؒ کی شان میں نازیبا الفاظ تھے۔ اور وہ بھی اس اسلوب سے کہ غم و غصہ کے انتقامی جذبات ایک ایک صفحہ سے ابلتے نظر آرہے تھے جو اس بات کے غماز تھے کہ اس تحریر کا محرک جذبہ کونسا تھا۔ اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام نے لکھا۔

> "حضرت علامہؒ زندہ ہوتے تو ملتِ اسلامیہ کے سامنے اس پمفلٹ کے جواب کے بہانے سے قرآن کریم کے حقائق و معارف کا ایک اور باب کھل جاتا۔ اب ان کی جگہ لینے والا کون ہے؟! لیکن مولانا صاحب کو مطمئن رہنا چاہیئے کہ

اگرچہ میکدہ سے اُٹھ کے چل دیا ساقی
وہ مے، وہ خم، وہ صراحی وہ جام باقی ہے

اور خمکدہ اقبالؒ میں ایسے ایسے رندانِ قدح خوار موجود ہیں جو ساقی کی چشمِ مست کے صدقے شرابِ ہندی اور بادۂ حجازی میں ایک نگاہ میں تمیز کر کے بتا دیں"۔

اس کے بعد لکھا :-

"طلوعِ اسلام جسے پیامِ اقبالؒ کی نشر و اشاعت کا فخر حاصل ہے اپنا فریضہ سمجھتا ہے کہ قرآنِ کریم کی روشنی میں متحدہ قومیت کے نظریہ کا تجزیہ کر کے مسلمانوں کے سامنے پیش کر دے"۔

سوراجی اسلام

اسی زمانہ میں پرویز صاحب نے ایک پمفلٹ "سوراجی اسلام" لکھا۔ اسکا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے :-

اسلام کے متعلق جو نظریہ عام قومیت پرست مسلم حضرات پیش کر رہے ہیں وہ اُن سے (یعنی ہندوؤں سے) بھی زیادہ افسوسناک اور مایوس کن ہے۔ ان حضرات کی تحریروں اور تقریروں سے واقف ہونے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس قسم کا اسلام وہ پیش کرتے ہیں وہ خود ان کے اپنے ہی دماغوں کی ساخت ہے۔ کتاب و سنّت کے اسلام سے اس کا کچھ علاقہ نہیں۔ اُن کے نزدیک بھی مذہب چند رسومات و عبادات کا ہی نام ہے۔

(صفحہ ۵۲۵)

مولانا پمفلٹ میں ابوالکلام مرحوم کے دورِ الہلال اور متحدہ قومیت کے دور کی تحریروں کا موازنہ کر کے بتایا گیا ہے کہ "انسان بھی ایک طرفہ تماشا ہے۔ جب اس کے رجحاناتِ قلبی و ذہنی اس کی نگاہ کا ایک زاویہ بدل دیں تو وہ کس قدر تضاد کا مجموعہ بن جاتا ہے اور کس طرح زہر کو آبِ حیات بنا کر پیش کرتا ہے"۔ (صفحہ ۵۲۵)

اسی سلسلہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

ہم ان کے اور ان کے ہم مسلک علمائے کرام کی خدمت میں بجز اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ ؎

سرمد در دین عجب شکستے کردی ایماں بفدائے چشم مستے کردی
با عجز و نیاز جملہ نقدِ خود را رفتی و نثارِ بُت پرستے کردی

یہ تو میں نے مشتے از خروارے کے طور پر مندرجہ بالا اقتباسات دیئے ہیں ورنہ ۱۹۳۸ء سے لیکر آج تک طلوعِ اسلام کانگریسی ملّایانِ کرام اور نقاب پوش مصلحین کو بے نقاب کرتا چلا آرہا ہے۔

ب آپ ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن" سے متعلق جسے بقول راجہ حسن اختر مرحوم حکیم الامّت قرآن کی گنگا جمنی تفسیر کہا کرتے تھے اور جس کے رد میں مجلہ معارف" میں ہندوستان میں سب سے پہلے جناب پرویز

مولانا محمد یوسف بنوری

مبسوط مقالہ شائع ہوا تھا۔ اس مقالہ میں پرویز صاحب نے "دورِ الہلال" اور متحدہ قومیت کے دور کو پیش کرکے ظاہر کیا تھا کہ خیالات میں تضاد تو ایک طرف مولانا نے خود آیات قرآنی کا جو ترجمہ اب کیا ہے وہ دورِ الہلال کے ترجمہ سے مختلف ہے۔

"ترجمان القرآن" پر پرویز صاحب کی اس تنقید نے ملک کے ارباب فکر و نظر کی توجہ کو اس طرف منعطف کر دیا اور بڑے بڑے جید علماء نے ان کی تفسیر (ترجمان القرآن) پر سخت اعتراضات کئے۔ (مثلاً) مولانا محمد یوسف بنوری اس باب میں لکھتے ہیں۔

"سورۃ فاتحہ کی تفسیر بہت طویل ہے اس لئے میں نے اس کا نہایت شوق سے مطالعہ کیا اور بعض دیگر آیات کی تفسیر جستہ جستہ مقامات سے دیکھی۔ دیکھ کر میرا شوق بجھ گیا اور سخت افسوس ہوا۔ اگر یہ تفسیر شائع نہ ہوتی تو اچھا ہوتا۔ میں نے تفسیر دیکھ کر محسوس کیا کہ اس شخص کے دماغ پر خودداری اور خود پسندی سوار ہے جس کا پہلا مرحلہ تقلید سے انکار تھا، اور دوسرا یہ جس نے سیدھی راہ ان پر گم کر دی۔ انہوں نے اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کی تفسیر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کے جملہ مذاہب خواہ وہ نصرانی اور یہودی دین ہو یا صابی۔ اگر کوئی شخص مذہب کی اسی صورت پر عامل رہے جسے لے کر اس مذہب کا شارع آیا تھا تو یہ امر اسکی نجات کے لئے کافی ہے۔"

(مشکلات القرآن کا دیباچہ)

دیکھ لیا آپ نے کہ مولانا محمد یوسف بنوری کی نظر میں بھی ابوالکلام صراطِ مستقیم سے بھٹک گیا تھا۔

مولانا مدنی کے معتقدین

علامہ اقبالؒ نے (مولانا) مدنی پر جو تنقید کی تھی اس سے مولانا صاحب کے معتقدین کے دل میں کس قدر تیز آتش انتقام بھڑک رہی تھی۔ اس کا اندازہ ان حضرات کی تقریروں اور تحریروں سے لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً ہندوستان کے رہنے والے مدنی مرحوم کے مرید نجم الدین اصلاحی صاحب نے "مدنی مرحوم کے مکتوبات" کو "مکتوبات شیخ الاسلام" کے عنوان سے تین جلدوں میں جمع کیا ہے۔ اس میں اصلاحی صاحب رقمطراز ہیں۔

"ہم ڈاکٹر صاحب مرحوم کو ایک شاعر اور فلسفی سے زیادہ حیثیت دینے کو شرعی جرم

سمجھتے ہیں۔"

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں۔

پاکستان میں قانون سازی کا اصول فکر اقبال کی روشنی میں ہو تو ہو سکتا ہے کیونکہ پاکستان جس اسلام کے نام پر بنا ہے وہ مرحوم ہی کے فلسفہ کا دوسرا نام ہے۔ ——— اس لئے ڈاکٹر صاحب مرحوم کو امام ابو حنیفہ اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم۔ اکابر اولیاء کے دوش بدوش بلکہ مع شی زائد مرتبہ دے دیا جائے تو پھر بھی کم ہے۔ مگر ہم ہندی طالب علموں کے نزدیک تو ڈاکٹر صاحب کا وہی مقام ہے جو علامہ اقبال صاحب سہیل مرحوم کا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آخر الذکر وکالت کی نذر ہو کر رہ گئے اور اول الذکر پنجاب کی نبوت خیز زمین کی بدولت آج شارح اور مفکر اسلام وغیرہ کے ناموں سے یاد کئے جا رہے ہیں۔ (صفحات ۲۷۲،۲۷۱)

متأثرین دیوبند میرے نزدیک یہی ہے وہ باطنی بیماری جو متأثرین دیوبند کو پاکستان گھن کی طرح کھائے جا رہی ہے۔ یہی ہے وہ جذبۂ انتقام جو انہیں پرویز دشمنی پر مختلف عنوانوں اور مختلف بہروپوں میں اکسا رہا ہے کیونکہ پرویز قرآن کی روشنی میں اقبال کے تصورات و احساسات کا عکاس ہے۔ بدیں وجہ یہ مذہب پرست مولویان کرام اور ان کے متأثرین مریدین پاکستان میں پوری آسائشیں اور راحتیں حاصل کرنے کے باوجود قیام پاکستان کے معمار اقبالؒ و جناحؒ کے تصورات کے حامل پرویز کو معاف کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

علامہ صدیقی صاحب جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، راقم الحروف کے اٹھائیس تیس سال قبل استاذ محترم میرزا عبدالحمید صاحب کی وجہ سے صدیقی صاحب سے جو دوستانہ مراسم ہیں، ان کی وجہ تحریک قیام پاکستان بنی تھی۔ میں دیانت داری سے سمجھتا ہوں کہ صدیقی صاحب کی تقریر اور "شہاب" نے مجھ پر "تحریک پاکستان انٹرنیشنلسٹ علماء" کے مؤقف کی حیثیت سے ذمہ داری ڈال دی ہے کہ میں ایک حقیقت نگار کی طرح احقاق حق اور ابطال باطل کروں۔ اس میں اس مقام پر میں صدیقی صاحب سے براہ راست گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) جس پرویز کی تقریر کے جملے کو آپ نے نکتۂ اختلاف بنایا تھا کہ "پاکستان میں تھیا کریسی نہیں ہوگی، اسلام کی حکومت ہوگی" یہ فرمان حضرت قائد اعظمؒ کا ہے، پرویز کا ذاتی نہیں۔ کے اس فرمان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مُلّائی تخیلِ اسلام سے پوری طرح واقف تھے۔

[حضر]ت بھی تصوّر سے پوری طرح آگاہ و خبردار تھے۔ آپ نے جو اختلاف کیا تھا وہ دراصل پرویز سے نہیں بلکہ [حضر]ت قائداعظمؒ سے اختلاف کیا تھا۔ کیا آپ اس قسم کی ذمہ داری قبول کریں گے؟

[بُ]تانِ عجم

(۲) — قائداعظمؒ نے جس اقبالؒ سے متاثر ہوکر نظریۂ پاکستان کی تائید کی تھی وہ نظم میں اپنے خیالات و احساسات کا اظہار کرتے ہیں۔ پرویز صاحب انہی کا نثر [میں] اعادہ کرتے ہیں۔ مثلاً۔

مسلماں ہے توحید میں گرمجوش — مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب — مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا — لغت کے بکھیڑوں میں اُلجھا ہوا

پھر ان دو اشعار پر خصوصیت سے غور فرمایئے۔

تمدّن، تصوّف، شریعت، کلام — بُتانِ عجم کے پجاری تمام!
حقیقت خرافات میں کھو گئی! — یہ اُمت روایات میں کھو گئی!

اب اگر پرویز تمدّن، تصوّف، شریعت اور کلام کو بُتانِ عجم کہہ کر اس حقیقتِ صادقہ کا اظہار کرے کہ جن روایات میں کھو کر اُمت خرافات میں کھو چکی ہے یہ عجمی سازش ہے تو اس میں اسکا آخر قصور کیا ہے؟ اگر پرویز ان روایات کو جو قرآن عزیز کے یکسر منافی و مخالف ہوں اور جن سے حضورِ اقدس و اعظم کی توہین کا افسوسناک پہلو نکلتا ہو، اور جن کی تصدیق میزانِ محمدی (قرآنِ عزیز) نہ کرتی ہو، وضعی کہہ کر مسترد کر دینے کے قابل قرار دیدے، تو جن کی نظر نورِ فراست سے خالی ہے وہ کیوں سیخ پا ہو جاتے ہیں! اور یہ بتانِ عجم کے پجاری پرویز کے متعلق طویل الزامات کی فہرست کیوں مرتب کر ڈالتے ہیں؟

اچھے علماء

باقی جس طرح حضرت قائداعظمؒ نے اچھے علماء (جنہوں نے مسلمانوں کی منفرد شخصیت اور الگ تشخص کے لئے تحریکِ قیامِ پاکستان کی حمایت کی تھی اور عظمتِ مسلم کے جھنڈے گاڑنے کے لئے نظریۂ پاکستان کی تائید کی تھی) تعریف کی تھی تو اس میدان میں پرویز بھی اُن سے پیچھے نہیں ہے ————— اُن کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔

> ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں اور ہماری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں اس لئے کہ ایک سچے عالم کی جتنی قدر ہمارے دل میں ہے شاید ہی کسی اور قلب میں ہوگی۔ ہم ایسے عالم کی خاکِ رہگذر کو اپنی چشمِ بصیرت کا سُرمہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمارا دل خون ہو کر رہ جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان حضرات نے اپنی غلط روی اور اپنی بات کی پچ میں عالم کے صحیح مرتبہ

کو خاک میں ملا دیا۔ اور آج مولوی کا لفظ انتہائی جہالت اور تنگ نظری کا مظہر قرار پاگیا۔(۵۹ء)
اور ایک مقام پر پرویز صاحب دورِ الہلال کے مولانا ابوالکلام آزاد کے وہ اقتباسات درج کرکے جن تحریروں نے اسلامیانِ ہند کے دل اسلام کے لئے گرماتے تھے اور مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کی حرارت پیدا کی تھی متحدہ قومیت کے "امام الہند" سے یوں بصد حسرت و یاس گو ہوتے ہیں۔

مولانا صاحب! آپ کا ہر ارشاد لعل و گہر میں تولنے کے قابل اور سر آنکھوں پر رکھنے کے لائق ہے: دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے"۔ یہ آپ کے دل کی آواز ہے۔ مگر وہ دل جس سے یہ صدائے ایمان پرور نکلا کرتی تھی کس بُت کافرکی نذر ہوگیا؟ ساری ملت آپ کے طورِ خطابت و تکلم اور سینائے فراست و بصیرت پر پیہم ارنی ارنی کی صدائیں لگا رہی ہیں۔ لیکن آپ ہیں کہ چپ ہیں۔ اور آپ کی طرف سے سابرمتی آشرم کی اینٹ اینٹ جواباً لن ترانی کے نعرے بلند کر رہی ہے۔ اب آپ خدائے واحد، رسولِ واحد، اور قرآنِ واحد سے مایوس ہو کر مشرکوں کے بے تاج بادشاہ گاندھی کی زندگی کو اسوۂ حسنہ قرار دے چکے ہیں اور مسلمانوں کو بھی اُسی طرف کھینچنے کے لئے مضطرب ہیں۔

خیابانِ خودی را دادہ آب!
ازاں دریا کہ طوفانے نہ دارد (صفحہ ۲۱۲، ۳۷ء)

(۳) قائداعظم نے جن مولویوں کے طبقہ کو بُرا کہا ہے کیا وہ طبقہ وہی نہیں جس نے آزاد و مدنی (مرحومین) کی زیرِ ہدایات قیامِ پاکستان کی شدید مخالفت کی اور جو اب بھی پاکستان میں سازش و شورش کی تصویر بنے بیٹھے ہیں۔ اور ایسی تحریکات اُٹھاتے رہتے ہیں جن سے اقبالؒ و جناحؒ متأثرین کو لوگوں میں بدنام کیا جا سکے۔ انہی کے متعلق میں نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۴۲ لکھا ہے:-

"مدنی مرحوم نے بھی جہاں تک ہو سکا پوری قوت و ہمت سے اپنی تمام توانائیاں مسلمانوں کے ملی تشخص کو برباد کرنے کے لئے صرف کر دیں اور قرآنِ عزیز کی واضح اور کھلی کھلی آیاتِ مقدسہ کو اُلٹے سیدھے معنی پہنا کر متحدہ قومیت کو حقیقی روحِ قرآنی دینے کے لئے اپنے علم و قلم کا زور صرف کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے زیرِ اثر علمائے دیوبند نے تقریباً ستانوے فیصدی قیامِ پاکستان کی مخالفت کی"۔

...ئے وقت
...ا مئی ۱۹۵۸ء

کسی نے "امام الہند" کی وفات پر پاکستان میں ان کی تعریف میں کچھ لکھا۔ حمید نظامی مرحوم و مغفور کی غیرت جوش میں آئی۔ قلم جنبش میں آگیا۔ ایک طویل مقالہ لکھا جس کا ایک اقتباس دیا جاتا ہے۔ غور سے ملاحظہ فرمائیے:-

" اب اگر ہندو سامراج کے آلۂ کار ابوالکلام قابلِ تعریف ہو سکتے ہیں، تو پھر میر جعفر اور میر صادق کو کیوں ملعون قرار دیا جاتا ہے، اور ان کے طرزِ عمل کو بھی سیاسی اختلاف کیوں نہیں کہا جاتا ؟

ابوالکلام اور اُن کے پیش رؤوں میں جو فرق ہے وہ صرف زمانہ کا ہے۔ دو سو سال کے زمانی بُعد نے بنگال اور دکن کے غداروں کو تو اس طرح بے نقاب کر دیا کہ وہ ننگِ آدم، ننگِ دین، ننگِ وطن نظر آنے لگے۔ لیکن ——————

زمانی قُرب، ذاتی تعلّقات اور پاس و لحاظ کی بدولت مسلمانوں کی جنگِ آزادی کے غدّار طرح طرح کے رنگین نقابوں میں چھپے ہوتے ہیں، مگر وہ دن دور نہیں جب حقیقت شناس مورخ ان نقابوں کو پارہ پارہ کر دیں گے اور جعفرِ آں زماں کے ساتھ جعفرانِ ایں زماں کی روحیں بھی قلزمِ خونیں میں مبتلائے عذاب نظر آنے لگیں گے۔ سجّاد انصاری نے جس ابوالکلام کی تعریف کی ہے وہ قرآنی دعوت دینے والے مولانا ابوالکلام تھے نہ کہ اس سے منحرف ہو جانے والے مسٹر ابوالکلام۔ اس کے علاوہ یہ تعریف جس کو محض لفّاظی کہنا چاہیئے اس قدر مبالغہ آمیز ہے کہ ابوالکلام اپنی زندگی کے روشن ترین دور میں بھی اس کے مستحق نہ تھے۔

اگر ابوالکلام کو پرکھنے کا یہی معیار ہے، تو پھر انہی سجّاد انصاری کا یہ قول کیوں نہ ملحوظ رکھا جائے کہ فرشتہ اور عالم دونوں گمراہ ہو کر شیطان بن جاتے ہیں۔ اسطرح "معلم الملکوت اور" حضرت امام الہند" کی زندگی میں حیرت انگیز مماثلت سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جائیگی کہ ہر عالم کی موت 'موتِ عالم' نہیں ہوتی۔ اور ایک مخصوص دور (دورِ آغاز) کی نیکیاں بقیہ زندگی کے گناہوں کا جواز نہیں بن سکتیں۔ (صفحہ ۹۷۷، ۹۷۸)

ئہ میرے خیال میں یہ تو ہو چکا ہے اور میں نے "تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" میں نظامی مرحوم کی اس آرزو کو پورا کر دیا ہے۔

دو سوداگر جناب احمد سعید یوسفی لدھیانوی نے "دو سوداگر" کے عنوان سے ایک پوسٹر لکھا تھا جو ابو سکندر لطیف نے سیالکوٹ شہر ممتاز برقی پریس سے شائع کیا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا۔

"ساتھ ہی کانگرس داناؤں کی دوربین نگاہوں نے تاڑ لیا کہ آزاد اُن کی تمنّا تے رام راجیہ کی تکمیل کا باعث ہو سکتا ہے، بانس پر چڑھانا شروع کیا۔ اولین دور میں مسلمان انہیں ایک مفسّرِ قرآن کی حیثیت سے جانتے تھے۔ آزاد نے اپنی اسی شہرت کی بنا پر متحدہ قومیت کے لئے اکبر کے دینِ الٰہی کی طرح ایک نئے دین کی بنیاد ڈالی۔ ترجمان القرآن عالمِ وجود میں آیا کہ اصل دین خدا پرستی اور نیکو کاری ہے۔ انسان جس مذہب میں چاہے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ اس نظریے نے کفر و شرک، اسلام و ایمان کے امتیازات کو ختم کر دیا۔ گاندھی جی نے اظہارِ مسرت کیا۔ ترجمان القرآن کی کئی جلدیں ہندی میں تیار کرائی گئیں۔ آزاد گاندھی کے منظورِ نظر بن گئے۔" (ص ۹۹)

انجام بخیر میرے نزدیک جس طرح مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کا ابتدائی دور جب وہ آریوں اور عیسائیوں سے مناظرے اور مجادلے کرتے تھے نہایت درخشندہ و تابناک تھا۔ اسی طرح مولانا ابو الکلام آزاد کا دورِ الہلال ہے۔ لیکن جس طرح مرزا قادیانی بعد میں اپنی سیدھی راہوں سے منحرف ہو کر غلط راستہ پر جا پڑے اور حضورِ اقدس و اعظم کی ختم المرسلینی کے بعد نبوت کا اعلان کر دیا، عین اسی طرح ابو الکلام نے بھی متحدہ قومیت کے دور میں اسلام سے مایوسی و بیزاری کا مکمل اعلان کیا۔ متحدہ قومیت کے دور کی بہت سی تحریروں کے علاوہ "انڈیا ونس فریڈم" کا صفحہ ۲۲۷ اس حقیقت پر شاہد ہے۔ جب میری اور مولانا غلام رسول مہر کی ابو الکلام کے متعلق بحث چلی تھی، میں ہفت روزہ "اقدام" اور "چٹان" میں لکھتے تھے تو میں نے اُس وقت بھی کہا تھا۔ اپنی کتاب میں بھی لکھا ہے اور اب پھر کہتا ہوں کہ اسلام کے متعلق ابو الکلام کے اعلانِ مایوسی و بیزاری کے بعد ان کی بازآفرینی کی ایک سطر بھی اگر کوئی صاحب پیش کر دیں تو میں اپنے اس خیال کو ترک کر دوں گا کہ وہ اس دنیا سے اسلام سے مایوس و بیزار سدھارے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اگر صدیقی صاحب! آپ بھی ابو الکلام کو قائدِ اعظمؒ کی یاد میں منعقد ہونے والے جلسہ میں بھی رحمت اللہ علیہ کہنے کی طرح تو ڈال دینا چاہتے ہیں تو پھر تحمل و تعصب سے کام نہ لیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی کو بھی رحمۃ اللہ علیہ کہیں۔ کیونکہ قرآن کی میزان میں دونوں کا کردار ایک ہے۔ میرے نزدیک تو

وار دہاتی فلسفہ بھی دین اسلام کے خلاف ایک مکمل فلسفہ تھا۔ اس لئے "قادیانی مُردہ باد" اور واردہاتی باد" تو فریقِ انصاف معلوم نہیں ہوتا۔ علم اس پر ہنستا ہے اور عقل ماتم کرتی ہے۔ اگر رحمت اللہ ہیں تو دونوں ہیں۔ اگر نہیں ہیں تو دونوں نہیں۔

یہ آیۂ نَو محترم صدیقی صاحب! جب کانگریس کے لیڈروں نے جیل سے رہائی کے بعد غالباً ۱۹۲۰ء میں ایک اجلاس کیا تھا جس کے بعد راشٹرپتی ابوالکلام نے کھل کر گاندھوی فلسفہ کا پرچار شروع کردیا تھا، تو حضرت حکیم الامّت کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی۔ آپ نے اپنے طنز کے نہایت تیز نشتر سے، ظریفانہ انداز میں کہا کہ ؎

یہ آیۂ نَو جیل میں نازل ہوئی مجھ پر
گیتا میں ہے قرآن، تو قرآن میں گیتا
مندر سے تو بیزار تھا پہلے ہی سے "بدری"
مسجد سے نکلتا نہیں ضدی ہے مسیتا

"امام الہند" نے جب واردہاتی فلسفۂ حیات کو اپنے قلم اور زبان کے ذریعہ پھیلانا شروع کردیا اور

شیخ ملت با حدیثِ دلنشین
بر مرادِ او کند تجدیدِ دین

کے مصداق نظر آنے لگے تو علامہؒ نے طنزاً کہا تھا کہ یہ آیۂ نَو جیل میں اُن پر نازل ہوئی ہے کہ قرآن اور گیتا ایک ہی ہیں۔ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں ہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ سوراج اسلام مہاتما گاندھی کے اشارہ وایما پر تراشا گیا تھا تاکہ متحدہ قومیت کے جال کو مضبوط کیا جاسکے۔ "بدری" تو ہندومت سے پہلے ہی مایوس تھا۔ اس نے گاندھی کے فلسفہ کو قبول کرلیا۔ لیکن ضدی مسیتا یعنی طائرانِ حرم (مسلمان) اس ہمرنگِ زمین جال میں گاندھی کی حسبِ خواہش نہ پھنس سکے۔ کیونکہ مسلمان گنہگار و خطاکار ہونے کے باوجود دامانِ محمّدی ہاتھ سے چھوڑنے کے لئے آمادہ نہ ہوا۔ کیا علامہؒ کی زبان میں اس آیۂ نَو کا جیل میں نازل ہونا اس حقیقت کا انکشاف نہیں کرتا کہ واردہاتی فلسفہ کو فلسفۂ اسلام کے مدمقابل ایک ہندوانہ یا گاندھوی فلسفہ قرار دیتے تھے۔

ابوالکلام نے تو مایوس بدری کی حوصلہ افزائی کے لئے اسلام کو نیچے لاکر ہندومت کی پست سطح پر کھڑا کردیا۔ لیکن یہ "ضدی مسیتا" خواجۂ یثرب کی عزت پر کٹ مرنے ہی میں اپنی

صدیقی صاحب! مجھے نہ آپ کی خدا واسطے کی مخالفت مقصود ہے نہ پرویز کی وکالت مطلوب۔ میں صرف خدا لگتی بات کہنا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ آپ نے پرویز صاحب کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے یا نہیں۔ اور اگر کیا ہے تو اسی طرح سے کیا ہے جس طرح آپ نے اس دن ان کی تقریر سنی تھی (کہ آپ ہمہ وقت اسی خیال میں گم تھے کہ آپ نے اُٹھ کر ان کی مخالفت کس طرح کرنی ہے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ اپنی تقریر میں ان کی طرف وہ باتیں منسوب کئے جا رہے تھے جن کا ایک لفظ بھی انہوں نے نہیں کہا تھا۔ اور سامعین آپ کی اس دیدہ دلیری پر انگشت بدنداں تھے) میں نے پرویز کی کم و بیش تمام تحریروں کا مطالعہ کیا ہے ___ ۱۹۳۸ء سے لے کر آج تک کی تحریروں کا ___ اور مطالعہ بھی خالی الذہن ہو کر کیا ہے۔ ان تحریروں کی روشنی میں، میں پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں اور اس کے لئے سندات پیش کر سکتا ہوں کہ پرویز وہ ہے۔

(۱) جس نے علامہ اقبالؒ کے اس ایمان پرور فرمان کو حرزِ جان بنا رکھا ہے کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

(۲) پرویز دنیا کے تمام اہل مذاہب سے برملا کہتا ہے کہ وہ دین جسے خدا کے آخری رسول محمد رسول اللہ نے پیش کیا تھا، بالآخر تمام نظامہائے عالم پر غالب آکر رہے گا۔ اور جب تک کاروانِ انسانیت ان راہوں کو اختیار نہیں کرے گا جن پر حضور ختمی مرتبت کے نقوشِ قدم تابندہ ستاروں کی طرح جگمگ جگمگ کر رہے ہیں، وہ کبھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکے گا۔

صدیقی صاحب! میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا جس شخص کا ایمان، عقیدہ، مسلک یہ ہو اور اسے وہ تیس پینتیس برس سے مسلسل و متواتر برملا پیش کرتا چلا آرہا ہو اس کے متعلق تأثرات دینا کہ وہ اسلام کا مخالف اور شانِ رسالت کا منکر ہے، کسی طرح بھی مبنی بر دیانت دا[ری] قرار دیا جا سکتا ہے؟ ذرا سوچئے کہ آپ تو بڑی ذمہ دار پوزیشن کے حامل ہیں!

پرویز عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے گھبرا کر واویلا نہیں کرتا۔ وہ نہایت عجز و خلوص سے قرآن [کی] روشنی میں جو خدائے خبیر و بصیر اور علیم و حکیم اور کریم و قدیم کا عطا کردہ ضابطۂ حیات ہے، ان کا [حل] تلاش کر کے اپنے فہم و فکر کے مطابق دنیا کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ یہ ہے وہ پرویز جس کی [illegible]

[illegible]

ایک منکشفہ

صدیقی صاحب نے ان پانچ چار علماء کا نام لیا جنہوں نے تحریکِ پاکستان کی حمایت کی تھی اور اس کے بعد فرمایا کہ کیا ان حقائق کی روشنی میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ علماء نے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی تھی؟ میں صدیقی صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا سارے ہندوستان میں علماءِ کرام یہی پانچ چار حضرات تھے؟ سنیئے! وہاں کیفیت کیا تھی۔ ہندوستان میں علماء کی سب سے بڑی نمائندہ (اور اس زمانہ میں واحد نمائندہ) جماعت، جمعیۃ العلماء ہند تھی۔ (پاکستان کے حامی علماء کی جمعیۃ الاسلام بہت بعد میں وجود میں آئی تھی) یہ جماعت پہلے دن سے آخری دم تک مطالبۂ پاکستان کی مخالف تھی۔ حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، حفظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہ اس جمعیت کے صدر اور سیکرٹری تھے اور ابوالکلام آزاد ان کے سرخیل۔ اس کے بعد احرار کی جماعت تھی جس میں باقی علماء دیوبند شامل تھے۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان کی جس قدر مخالفت کی تھی اس کا کسے علم نہیں۔ اس کے بعد جماعتِ اسلامی میں شامل علماء پاکستان کے مخالف تھے۔ سرحد میں سرخپوشوں کے حامی علماء پاکستان کے خلاف تھے۔ بہار میں انصار اس کے مخالف تھے۔ کیا ان سب کا کفّارہ ان پانچ چار علماء نے ادا کر دیا تھا جن کا نام لے کر صدیقی صاحب فرماتے ہیں کہ ہندوستان کے علماءِ کرام مطالبۂ پاکستان کے حامی تھے۔ انسان کو حقائق سے اس قدر بھی آنکھیں بند نہیں کر لینی چاہئیں۔

ہفت روزہ شہاب

شہاب (جس کے مدیر کوثر نیازی صاحب ہیں) صدیقی صاحب کی حمایت میں ایک قدم آگے بڑھ گیا ہے۔ اس نے اپنی ۱۷ر ستمبر کی اشاعت میں لکھا ہے کہ

> نیشنلسٹ علماء کے ساتھ سیاسی اختلاف ہمیں بھی ہے۔ لیکن ان قابلِ صد احترام بزرگوں کی عظمت اس اختلاف کی وجہ سے کم نہیں ہوتی۔ وہ بعض اصولی شبہات پر ہم سے اختلاف کرتے تھے اور بعض تشدّد پسند علماء کی موجودگی میں ہمیں یہ اعتراف کر لینا چاہیئے کہ ان کے شبہات یکسر بے بنیاد نہیں تھے۔

نیشنلسٹ علماء کے ساتھ شہاب کا اختلاف محض سیاسی نوعیت کا ہے۔ دین سے اس کا تعلق نہیں۔ ہم مدیر شہاب سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ جب علامہ اقبالؒ نے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی ؒ سے کہا تھا کہ

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است! چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

تو کیا یہ محض سیاسی اختلاف تھا۔ اور علامہ مرحوم "دین" کا نام محض برائے وزنِ بیت لے رہے تھے؟ پھر اس سلسلہ میں علامہ مرحوم کا وہ بیان پڑھیے جس میں انہوں نے ان حضرات سے اختلاف کی پوری پوری تشریح فرمائی ہے۔ ذرا اس بیان کو پڑھ کر بتائیے کہ آیا وہ اختلاف سیاسی تھا یا اس کی کوئی دینی اہمیت بھی تھی! پھر سب سے اہم بات یہ کہ ــــ کیا خود پاکستان کے مطالبہ کی بنیاد سیاسی تھی یا یہ دین کا مطالبہ تھا؟ میں مدیرِ شہاب سے گزارش کروں گا کہ وہ اس نکتہ پر ذرا کھل کر بات کر[یں]۔

شہاب ... ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور لکھتا ہے۔

علماء پاکستان کے جس تصور کی مخالفت کرتے تھے، وہ وہی تصور تھا جسے محترم پرویز صاحب اور ان کے کچھ ساتھی پاکستان میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے نظریۂ پاکستان پیش کرتے ہوئے (اور قائداعظمؒ نے اس کی تائید کرتے ہوئے) … فرمایا کہ ہم مسلمانوں کے لئے ایک الگ خطۂ زمین کا مطالبہ اس لئے کر رہے ہیں کہ وہاں اسلام … احیاء کیا جائے۔ نیشنلسٹ علماء نے اس مطالبہ کی مخالفت کی۔ شہاب کے اس بیان سے واضح ہے کہ اقبالؒ اور جناحؒ اس اسلام کا احیاء چاہتے تھے جسے اب پرویز پاکستان میں نافذ کر[نا] چاہتا ہے۔ اگر بات یہی ہے تو پھر آپ پرویز کی مخالفت کیوں کرتے ہیں، اقبالؒ اور جناحؒ کی مخالفت کیجئے اور کھلے بندوں سامنے آئیے۔ پرویز کا نام لے کر اقبالؒ اور جناحؒ کو کوسنا، تو … نہیں کہلا سکتا! اور اگر اقبالؒ اور جناحؒ کا اسلام، اس اسلام سے مختلف تھا جسے پرویز پیش کر رہا ہے تو پھر نیشنلسٹ علماء اقبالؒ اور جناحؒ کی مخالفت کیوں کرتے تھے؟

شہاب نے یہ بھی لکھا ہے کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد سید سلیمان ندوی مرحوم کو پاکستان … ابوالکلام آزاد صاحب ہی نے بھیجا تھا۔

اگر یہ صحیح ہے تو آنے والے مؤرخ کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ خود سید سلیمان ندویؒ کے متعلق بھی ذرا زیادہ چھان بین سے کام لے کہ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ

یکے دزد باشد دگر پردہ دار

...ایتی پیش فرمائی ہے کہ ـــ طلوع اسلام کا نام 'تقسیم ہند کے بعد سننے میں آیا تھا پہلے نہیں
اس کے جواب میں' میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کروں کہ ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ!

احسان صاحب اگر فرمائیں تو انہیں طلوعِ اسلام کے ۱۹۳۸ء کے دور کے فائل دکھا دیئے جائیں؟ اس سے کم از کم انہیں اتنا علم تو ہو جائے گا کہ اس مجلہ نے اس زمانے میں تحریکِ پاکستان کی حمایت ' اور نیشنلسٹ علماء کی مخالفت میں کیا کچھ کیا تھا۔ اس سلسلہ میں، میں علیٰ وجہ البصیرت اتنا اور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر کسی نے نظریۂ پاکستان کی تاریخ مرتب کرنی ہو تو اس کے لئے طلوعِ اسلام کے فائل دیکھے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں ہوگا۔

چٹان

ہفت روزہ چٹان نے اپنی ۲۴ جولائی ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ :-

پرویز کا اسلام سوختنی ہے نہ فروختنی

کس قدر سچی بات نکل گئی ہے اس مجلہ کی زبان سے! پرویز کا اسلام واقعی قابلِ سوختنی نہیں کیونکہ وہ مشتمل ہے قرآنِ حکیم کے ان حقائق پر جنہیں باطل کی کوئی آگ جلا نہیں سکتی۔ باقی رہا "قابلِ فروختنی اسلام" سو وہ کہاں ملتا ہے، اس کے متعلق خود محترم مدیر چٹان کی زبان سے سنیئے (انہوں نے چٹان جلد نمبر ۸ شمارہ نمبر ۱۶ مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۵۵ء میں بوئے گل۔ نالۂ دل۔ دودِ چراغِ محفل" (قسط نمبر ۱۰) میں اس روئیداد کو ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا۔ (اسے میں نے اپنی کتاب میں بھی درج کیا ہے) غور سے سنیئے :-

"جہاں تک کانگریس کے روپے کا تعلق ہے وہ خود مولانا حبیب الرحمٰن کے علم میں ہے بلکہ پچاس ہزار روپے کی قسط دلوانے کے حصہ دار ہی آپ تھے۔ رہا لیگ یونینسٹ پارٹی کے روپے کا سوال تو میرا مخبر تمام کاغذات شاہ جی یا مولانا غلام غوث کو دکھانے کیلئے تیار ہے۔ ان کے سوا وہ کسی کو بھی کاغذ دکھانے کے حق میں نہیں۔ وہ سب کو نا قابلِ اعتبار سمجھتا ہے۔"

...چل کر وہ لکھتے ہیں :-

"جب مولانا دھتکار کر جانے لگے تو شاہ جی نے روک لیا: مولوی صاحب! آپ کہاں جا رہے ہیں۔ آپ تشریف رکھیں۔ آپ کے خلاف احرار کی خلاف شورش [illegible]

رک گئے، میں نے ترتیب وار چارج لگانے شروع کئے۔ کانگریس کا روپیہ ساٹھ ہزار۔ دس ہزار کی ایک قسط اور پچاس ہزار کی دوسری قسط۔ اور یونینسٹ پارٹی ۔۔۔!! ابھی فقرہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ مولانا غلام غوث نے ایک ایک شق پر زور دیا۔ کچھ دیر تو سناٹا چھایا رہا۔ پھر سکوت ٹوٹا۔ مولانا نے تسلیم کیا کہ یہ روپیہ لیا گیا ہے۔ لیکن اُس وقت اُن کے ذہن میں صحیح یا د نہیں کہ یہ رقم کتنی ہے بات صبح پر ملتوی ہو گئی۔

پھر تحریر ہے:-

مولانا مظہر علی نے تسلیم کیا کہ یہ روپیہ لیا گیا ہے لیکن اس کے سزاوار وہ تنہا نہیں بلکہ باقاعدہ مشورہ سے رقم قبول کی گئی ہے۔ پہلا دس ہزار روپیہ مولانا داؤد غزنوی نے دیا تھا اور شیخ حسام الدین اُس وقت موجود تھے۔ دوسری قسط بھی انہیں حضرات کے مشورے سے حاصل کی گئی۔

یعنی ۔۔۔ شیخ حسام الدین نے مولانا حبیب الرحمٰن کو لدھیانہ خط لکھا کہ وہ کلکتہ میں کانگرس ہائی کمانڈ تک پہنچیں۔ یہ خط لیکر خاقان بابر (مولانا مظہر علی کے صاحبزادے) لدھیانہ پہنچے۔ مولانا ابوالکلام ایک لاکھ روپے کے لگ بھگ رقم دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر سردار پٹیل نے جو کانگرس کے خازن تھے اس سے اختلاف کیا اور پچاس ہزار روپے کی رقم کا چیک لالہ بھیم سین سچر کی تحویل میں دیا گیا جو انکی معرفت دفتر احرار میں پہنچا پھر اس رقم کی بندر بانٹ کی گئی۔ وہ رقم جو یونینسٹ پارٹی سے وصول کی گئی اُس کو بہ اختلاف مولانا نے تسلیم کیا اور وہ رقم جو دو چار ہزار بطور چندہ فراہم کی گئی یہ تمام ملکر پچانوے یا پچاس ہزار بنتے ہیں۔ جب مولانا مظہر علی نے بتایا کہ نواب زادہ نصراللہ خان کے سوا ورکنگ کمیٹی کے ہر امیدوار ممبر نے اُن سے روپیہ لیا ہے تو سب نے تسلیم کیا۔ شیخ حسام الدین مان گئے، ماسٹر تاج الدین نے سر ہلا دیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن نے بھی صاد کیا۔"

حرفِ آخر آخر میں، میں پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ مجھے نہ کسی سے خدا واسطے کا بیر ہے، نہ وکالت مقصود۔ میں ان حضرات سے صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب کسی کی مخالفت کریں تو حقائق کو توڑ نہ چھپائیں۔ ایسا کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حقیقت ایک دن سامنے آجاتی ہے اور جب وہ سامنے آتی ہے تو آپ کے مخالف کا کردار اور بلند ہو جاتا ہے اور آپ حضرات لوگوں کی نگاہوں سے گر جاتے ہیں۔ خدا کرے کہ اس ناصح مشفق کی بات آپ کی سمجھ میں آجائے۔ والسلام!

ذکرِ اللہ

عربی زبان کے وہ تمام الفاظ جو قرآن کریم میں استعمال ہوئے ہیں مخصوص اور متعین مفاہیم رکھتے ہیں، جن کی وضاحت محاورۂ عرب اور تصریفِ آیات کے تحت اپنے موضوع کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ اسی سے دین اسلام اپنی اصلی اور منزّہ شکل میں سامنے آتا ہے جو خالصتاً قرآنِ حکیم کے عطا کردہ عقائد و نظریات پیش کرتا ہے اور وہ ابدی اصول و اقدار دیتا ہے جن میں کبھی ردّ و بدل نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب قرآنی الفاظ و اصطلاحات کو محاورۂ عرب اور عربی زبان کے قواعد کے مطابق سمجھنے کے بجائے اپنی زبانوں کے معانی پہنا دئیے جاتے ہیں تو بات کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ پھر دین، دین نہیں رہتا۔ مذہب بن جاتا ہے۔ نتیجتاً ہم دین اسلام کے پیروکار ہونے کی جگہ مذہبِ اسلام کے پابند ہو جاتے ہیں اور اسی جھوٹے اطمینان کے ساتھ ہماری زندگی بسر ہو جاتی ہے۔ جن بیسیوں قرآنی الفاظ و اصطلاحات کو شرف بہ مذہب، کیا گیا ہے ان میں سے ایک قرآنی اصطلاح "ذکر اللہ" کی بھی ہے۔ جس کا مطلب ہمارے ہاں اللہ کا ذکر کرنا اس صورت میں لیا جاتا ہے کہ زبان سے اللہ اللہ کہتے ہوئے تسبیح کے دانوں پر سینکڑوں ہزاروں مرتبہ گنتے چلے جاؤ یا ذکر سے مراد خانقاہوں میں "ہو حق" کی ضربیں لگانا ہے۔ تلقین بھی اسی کی کی جاتی ہے کہ اللہ اللہ کہتے رہو۔ اسی سے اللہ کی قربت حاصل ہوگی۔ ظاہر ہے کہ جب اتنی آسانی سے یہ بڑا مرتبہ حاصل ہو رہا ہو تو کون اسے حاصل کرنا نہ چاہے گا۔ مذہب نے تو یہ خود فریبی مہیا کر دی لیکن دین کیا کہتا ہے۔ آئیے ذرا ادھر بھی کان دھر لیں شاید اس فریب خوردگی کا طلسم ٹوٹ سکے۔

قدیم مستند عربی لغت (تاج و راغب) میں الذکر کا مطلب کسی چیز کو محفوظ کر لینا اور کسی بات کو [illegible] کر لینا آیا ہے۔ ذَکَرَ حَقَّهٗ کے معنی ہیں اس کے حق کی حفاظت کی اور اس کو ضائع نہیں کیا۔ اسی طرح اُذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ کا مفہوم ہے تم پر جو خدا کے احسانات ہیں ان کی حفاظت کرو۔ اور انہیں ضائع مت کرو۔ (تاج و راغب بحوالہ لغات القرآن، پرویز) ذکر کے دیگر معانی میں شہرت، کسی کے [illegible] اچھی بات کہنا، شرف و عزت اور عبرت و موعظت شامل ہیں اور ذکر اس کتاب کو بھی کہتے ہیں جس میں [illegible] کی تفصیل [illegible] مضامین بھی درج ہوں۔ قرآن کریم کو الذکر کہا گیا ہے [illegible] مثلاً [illegible]

اقوام وملل کے عروج وزوال کے قوانین بھی ہیں اور تاریخی یادداشتیں بھی (لغات القرآن)۔ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (۲/۱۵۲) اس کے معنی یہ ہیں کہ تم میرے قوانین کو اپنے سامنے رکھو تو میں تمہارے حقوق کی حفاظت کرونگا۔ اور تمہیں عزت وسطوت عطا کرونگا۔ ان قوانین کا اتباع کرو گے تو ان کے خوشگوار نتائج یقیناً تمہارے سامنے آئیں گے" قرآن کے بیان سے یہ حقیقت واضح ہے کہ ذکر اللہ سے مراد قوانینِ خداوندی کا اِتّباع ہے تسبیح کے دانوں پر اللہ اللہ گنتے رہنا نہیں۔ قرآن کریم کی تعلیم کا یہ مقصود نہیں کہ مختلف النوع دانوں کی مالاؤں کو تسبیح کا نام دے کر ہاتھ میں پکڑ لیں اور اللہ اللہ پکارتے ہوئے ان دانوں پر انگلیاں پھیرتے چلے جائیں۔ ذکر کی طرح "تسبیح" کا لفظ بھی قرآن میں مستعمل ہے جو بڑی اہمیت کا حامل ہے اس لئے کہ عربی زبان میں تسبیح کے معنی ہوتے ہیں کسی کام کی تکمیل کے لئے پوری پوری تگ وتاز کرنا۔ امکان بھر جدّوجُہد کرنا۔ ہر وقت سرگرمِ عمل رہنا۔ چنانچہ تسبیح سے مفہوم قوانینِ خداوندی کی اطاعت میں پوری پوری جدّوجُہد اور سرگرمیٔ عمل ہے۔ اس مادہ سے تیزی، مضبوطی، شدت کا پہلو ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے خدا کے پروگرام کی تکمیل میں مضبوطی اور شدت کے ساتھ مصروفِ جدّوجُہد رہنا تسبیح ہے۔ ارشاد ہوتا ہے فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (۵۶/۹۶) اس فرمانِ ربّی کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے نشوونما دینے والے رب کے ربوبیتِ عامہ کے پروگرام کو مشہود طور پر مستحقِ حمد وستائش بنانے کے لئے سرگرمِ عمل ہو (فَسَبِّحْ) یعنی اُسے اس انداز سے متشکل کرو کہ ساری دنیا پکار اُٹھے کہ فی الواقعہ قابلِ صد ہزار حمد وستائش ہے وہ ذات جس کا نظام ایسے خوشگوار اور انسانیت ساز نتائج پیدا کرتا ہے (مفہوم القرآن) اسی تسبیح کے حوالے سے سورۃ الصّٰفّٰت میں آیا ہے۔ وَإِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُونَ (۳۷/۱۶۶) یعنی ہم یقیناً اسی راہ میں انتہائی قوت کے ساتھ جدّوجُہد کرنے والے ہیں (ہم عمر بھر سرگرمِ عمل رہیں گے) قرآن کریم میں حضرت موسیٰ کے فرعون کے مقابلہ میں جانے کو ذکر اور تسبیح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جہاں کہا گیا ہے کَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيرًا (۲۰/۳۳) وَنَذْكُرَكَ كَثِيرًا (۲۰/۳۴) حضرت موسیٰؑ کے ذمہ فریضہ یہ عائد کیا گیا تھا کہ وہ جائیں اور فرعون اور اس کے طاغوتی لشکر کو شکست دیں اور بنی اسرائیل کو غلامی ومحکومی کی پستیوں سے نکال کر حکومت وسطوت کی بلندیوں پر لے جائیں اور ان کی حکومت کی بنیاد قوانینِ خداوندی پر رکھیں۔ اس عظیم الشان مہم کے لئے آپ نے اللہ تعالیٰ سے تائید ونصرت کی التجا کی اور اپنے قوتِ بازو حضرت ہارونؑ کو بھی اپنی معیت کے لئے مانگا تاکہ وہ عظیم الشان مہم سر ہو سکے۔ اس کیلئے قرآن میں تسبیح اور ذکر کے الفاظ آئے ہیں۔ جس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے "تاکہ ہم تیری تسبیح بیان کریں" "اور بہت زیادہ ذکر کریں" اگر یہاں تسبیح اور ذکر کے اصل معانی پیشِ نظر رکھیں جائیں اور حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے مابین مقابلے کے حوالے سے سمجھا جائے تو تسبیح اور ذکر کا مفہوم واضح ہو

جاتا ہے اور وہ ہے دنیا سے غیر خدائی قوتوں کے غلبہ اور غاصبانہ قبضے اور فساد کو مٹا کر اس کی جگہ حکومتِ خداوندی کو قائم کرنا اور اس کی بقا کے لئے جدوجہد کرتے رہنا۔ یہ نہیں کہ مزاروں اور خانقاہوں کی تاریکیوں میں سر بزانو ہزار ہزار دانوں کی تسبیح پر زبان سے اللہ کا نام دہراتے رہنا۔ اور عملی طور پر طاغوتی قوتوں کی ماتحتی اور جی حضوری میں ساری زندگی گزار دینا۔ اقبالؒ کے نزدیک وہ تسبیح و ذکر تھا، مردانِ خود مست و خود آگاہ کا۔ اور یہ تسبیح و ذکر جو ہم نے اختیار کر رکھا ہے یہ کشمکشِ زندگی سے منہ موڑنے اور اللہ ہو اللہ ہو کی معرفت کا نام ہے۔ اقبالؒ نے کہا تھا:-

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل | یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست | یہ مذہبِ ملاّ و جمادات و نباتات

قرآن کریم کی بیسیوں آیات میں ذکر اور تسبیح کی وضاحت ملتی ہے جو انقلابِ قرآنی کا ایک مسلسل و مستقل عملی پروگرام ہے۔ لیکن عمل تو عمل ٹھہرا، اور جہاں محض زبان ہلاتے رہنا ہی مقصود بالذات بن جائے وہاں عمل کا کیا دخل! جبکہ قرآن کا فرمان یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں ایک ایک قدم پر قانونِ خداوندی کو سامنے رکھنا اور اس کے مطابق فیصلے کرنا ذِکر ہے۔ اشیائے کائنات پر غور و فکر کرنا ذِکر ہے ($\frac{16}{13}$) قوانینِ خداوندی کو خود ذِکر اللہ ہیں ($\frac{39}{23}$) کا عام چرچا کرنا بھی ذِکر ہے۔ آج کی اصطلاح میں اسے نشر و اشاعت کرنا کہتے ہیں۔ یہی وہ ذِکر اللہ ہے جس سے دلوں کو سچا اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ یہی وہ خدا کا قانون ہے جس سے ذہنی و قلبی طمانیت میسر آتی ہے۔ خدا کے قانون کو سمجھنے کے بعد جو اطمینان ملتا ہے اسی سے اس پر ایمان لانے کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔ اور ایمان اُسی کا ہے جو بطیبِ خاطر قلب و دماغ کے پورے اطمینان کے بعد حقیقت کو تسلیم کریں۔ سورۃ الرّعد کی ۲۸ ویں آیت میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

سورہ الانفال میں مومنین کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ $\frac{8}{2}$ "بیشک جب قوانینِ خداوندی کا مجموعی تصور (ذِکرُ اللہ) ان کے سامنے لایا جاتا ہے تو ان کی خلاف ورزی سے جو تباہی آتی ہے اس کے احساس سے اُن کے دل کانپ اُٹھتے ہیں۔ اور جب ان قوانین کی تفصیلات ان کے سامنے آتی ہیں تو (اُن پر عمل پیرا ہونے کے خوشگوار نتائج کے تصور سے) ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے نشو و نما دینے والے کی [illegible] [illegible] کبھی دھوکہ نہیں دے گی۔" (مفہوم القرآن) [illegible]

لئے دوسری جگہ کہا گیا ہے فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۳۹/۲۲ جن کے دل قانونِ خداوندی کی قبولیت کے لئے پتھر جیسے سخت اور جامد ہو جائیں ان کے لئے تباہی و بربادی ہے"۔ سورۃ المنٰفقون میں خبردار کیا گیا ہے کہ "دیکھنا! تمہاری اولاد یا دولت تمہیں ذکر اللہ (قوانینِ خداوندی) سے غافل نہ کر دے" — اس سے تم سراسر گھاٹے میں رہو گے (۶۳/۹) سورۃ النور میں مومنین کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ کاروبار یا خرید و فروخت کرتے ہوئے وہ ذکر اللہ سے غافل نہیں ہوتے۔ یعنی قوانینِ خداوندی کے مطابق تجارت وغیرہ کرتے ہیں۔ اگر واقعی ذکر اللہ کی پابندی کی جائے تو معاشرے میں بے ایمانی۔ بددیانتی۔ جھوٹ۔ رشوت۔ ملاوٹ۔ سمگلنگ پر مبنی تمام تجارت کا کہیں وجود نہ ہو۔ مگر کہاں قرآن کا عطا کردہ ذکر اللہ اور کہاں ہزار کی تسبیح اور لاکھ کی تسبیح والا ذکر جس کا قوانینِ خداوندی سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اس طرح جب ضابطِ خداوندی کو پسِ پشت ڈال دیا جائے تو شیطنت غالب آجاتی ہے یعنی اپنے مفاد پرست سرکش جذبات مسلط ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف ذکر اللہ کی تسبیح پڑھ کر خود کو فریب دے لیا جاتا ہے کہ ہم نے نیک کام کر لیا اللہ کو یاد کر لیا اور دوسری طرف ہمارے اُمور جذبات کے تابع انجام دئے جاتے ہیں قرآن نے ایسے لوگوں کو حزب الشیطان کا نام دیا ہے۔ اور یہ اعلان کیا ہے کہ اچھی طرح سمجھ لو کہ شیطانی پارٹی ہمیشہ خاسر و نامراد رہتی ہے۔ (۵۸/۱۹) سورۃ الکہف میں یہ ہدایت ملتی ہے کہ جس کے دل نے ہمارے ذکر یعنی قوانین کو فراموش کر دیا کبھی اس کی بات نہ ماننا۔ اس کا اتباع نہ کرنا۔ (۱۸/۲۸) سورۃ الجن میں فرمودۂ خداوندی ہے وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ۷۲/۱۷ "اور جو شخص رب کے ذکر سے اعراض برتتا ہے یعنی خدا کے قانونِ ربوبیت سے روگردانی کرتا ہے وہ سخت مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے"

قرآنِ کریم کی متعدد آیات میں ذکر و تسبیح کی اہمیت و عظمت بیان ہوئی ہے اور مومنین سے خطاب کر کے ان کے اس فریضۂ زندگی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہوتا ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۳۳/۴۱ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۳۳/۴۲ "اے ایمان والو! قرآن کے قوانین کو اس طرح اپنے سامنے رکھو کہ کبھی بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائیں۔ اور صبح شام دن رات ان قوانین کی عملی تنفیذ کے لئے انتہائی کوشش کرتے ہوئے سرگرمِ عمل رہو" (مفہوم القرآن)۔ قرآن، کائنات کی مثال دیتے ہوئے بتاتا ہے کہ کائنات کی پستیوں اور جو کچھ بلندیوں میں ہے۔ وہ سب اس پروگرام کی تکمیل میں جو قانونِ خداوندی کی رُو سے ان کے لئے متعین کیا گیا ہے پوری شدت اور تیزی سے مصروفِ عمل ہے۔ (۵۷/۱) اور انسان کو اختیار و ارادے کا شرف اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر غور و فکر سے کام لے کر ذکر اللہ اور تسبیح کا فریضہ ادا کرتا رہے۔

سورہ آلِ عمران میں اس فریضہ کی بڑی وضاحت سے نشان دہی کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۳/۱۸۹ اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۳/۱۹۰ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ عقل و بصیرت سے کام لیتے ہیں ان کے لئے کائنات کی پیدائش اور دن رات کی گردش میں قوانینِ خداوندی کی محکمیت اور ہمہ گیری کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ ان صاحبانِ عقل و بصیرت اور اربابِ فکر و نظر کے لئے جو زندگی کے ہر گوشے میں کھڑے، بیٹھے، لیٹے قانونِ خداوندی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں۔ اور کائنات کی تخلیقی ترکیب (اندازِ پیدائش) پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور اپنی تحقیقات کے بعد علیٰ وجہ البصیرت پکار اُٹھتے ہیں کہ "اے ہمارے نشوونما دینے والے تو نے اس کارگہِ ہستی کو نہ تو عبث اور بیکار پیدا کیا ہے اور نہ ہی تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لئے۔ تیری ذات اس سے بہت بلند ہے۔ اور یہ بات تجھ سے بہت بعید ہے کہ تو کسی شے کو بے مقصد اور بلا غرض و غایت یا تخریبی نتائج مرتب کرنے کے لئے پیدا کر دے۔ یہ ہماری کم علمی اور کوتاہ نگہی ہے کہ ہم تحقیق سے کام نہیں لیتے اور اس طرح اشیائے کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بے بہرہ رہ کر عذاب کی زندگی بسر کرتے ہیں، تو ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم علمی تحقیقات اور عملی تجربات کے بعد اشیائے کائنات سے صحیح صحیح فائدہ اُٹھائیں اور اس طرح تباہ کن عذاب کی زندگی سے محفوظ رہیں۔" اس تشریح و توضیح سے یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ تخلیقِ ارض و سماوات پر غور و فکر کا نام ذکرِ خداوندی یا ذکر اللہ ہے اور دوسری بات یہ کہ جماعتِ مومنین پر یہ فریضہ عائد کیا گیا ہے کہ وہ قوانینِ کائنات اور مظاہرِ فطرت پر غور و فکر اور تحقیق و تدقیق کے بعد دنیا پر یہ ثابت کرے کہ خدا نے اس دنیا اور تمام کائنات کو باطل پیدا نہیں کیا۔ اسے باطل سمجھنا کفر ہے۔

یہ ہے وہ ذکر اللہ جسے عملی طور پر اختیار کرنے کا تمام مومنین کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے اور جو ہماری ساری زندگی کو محیط ہے۔ اس ذکرِ عظیم کو ہم نے تسبیح کے دانوں میں محدود اور مقید کر رکھا ہے اور یہ وہ تسبیح ہے جو عیسائی راہبوں کے ہاں ہوتی تھی جسے انہوں نے بدھ مت والوں سے مستعار لیا تھا۔ عیسائیوں سے آگے بڑھی تو ہم مسلمانوں نے اسے جزوِ ایمان بنا لیا۔ اس ذاتِ اقدس و اعظم کی نبوت پر ایمان رکھتے ہوئے جس کے متعلق فرمانِ ربی ہے۔ اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا ۷۳/۷ "بیشک تیرے لئے دن میں بڑا لمبا پروگرام ہوتا ہے تجھے بڑی جدّوجہد کرنی ہوتی ہے" اور اسی جدّوجہد کی پیروی ہر مومن پر فرض کی گئی ہے، اس ارشاد کے ساتھ کہ جو ذکر اللہ کو پوری طرح اختیار کرتے ہیں ان کے

— بقیہ صفحہ ۴۵ پر —

دیوبندی علماء کا تصورِ مملکتِ اسلامی!

اپنے زمانہ کے دیوبند کے شیخ الحدیث، (مولانا) حسین احمد مدنی مرحوم کا مسلک یہ تھا:۔
"ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل ہوں، حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصولوں کے عین مطابق ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے۔"

(زمزم - مورخہ ۲۸ جولائی ۱۹۳۸ء)

(مولانا) اسرار احمد آزاد (دیوبندی) نے واضح تر الفاظ میں کہا کہ:۔
"یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علمائے ہند، اس ملک میں اسلامی حکومت کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم ازکم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کے قیام کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔"

(ہندوستان کا نیشنلسٹ اخبار مدینہ بجنور، ۱۷ اپریل ۱۹۴۷ء)

اور (مولانا) مفتی محمود مرحوم، جو اس پاکستان میں، صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ کے منصب پر بھی فائز رہے کے متعلق جمعیت علماء پاکستان کے سیکرٹری نائب صدر، سید محمود شاہ گجراتی نے کہا کہ:۔
"مولانا مفتی محمود نے خود پی این اے کے ایک اجلاس میں کہا تھا کہ وہ پاکستان کو قائم کرنے کے گناہ میں شامل نہیں تھے۔"

(روزنامہ مشرق، ۱۰ دسمبر ۱۹۷۲ء)

رابطہ باہمی — بزم طلوع اسلام چنیوٹ

محترم محمد منشاء عروج صاحب نے چنیوٹ سے اطلاع دی ہے کہ وہاں کے احباب نے اپنے ہاں نئی بزم تشکیل دی ہے، اور انہیں نمائندہ منتخب کیا ہے۔ ادارہ / ٹرسٹ اس بزم اور اس کے نمائندہ کی بمسرت توثیق کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان احباب کی قرآنی تعلیم کو عام کرنے کی مساعی کو شرفِ قبولیت بخشیں۔ ناظم ادارہ

ہندوؤں کے اصولِ سیاست

ہندوؤں کی تاریخ میں ایک ہی سیاسی فلاسفر کا نام ملتا ہے۔ یعنی چانکیہ۔ اس کا لقب کوٹلیہ تھا جس کے معنی مکار اور فریب دہ ہیں۔ اس فلاسفر نے اصولِ سیاست پر ایک کتاب لکھی ہے جسے ارتھ شاستر کہا جاتا ہے۔ یہ شاستر، ہندو لیڈروں کے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں سیاست کے جو چند اصول بطور ضابطۂ ہدایت دیئے گئے ہیں، وہ قابلِ غور ہیں:۔

پہلا اصول:۔ حصولِ اقتدار اور ملک گیری کی ہوس کبھی ٹھنڈی نہ ہونے پائے

دوسرا اصول:۔ ہمسایہ سلطنتوں سے وہی سلوک روا رکھا جائے جو دشمنوں سے روا رکھا جاتا ہے تمام ہمسایوں پر کڑی نگرانی قائم رکھی جائے۔

تیسرا اصول:۔ غیر ہمسایہ حکومت سے دوستانہ تعلقات استوار رکھے جائیں۔

چوتھا اصول:۔ جن سے دوستی رکھی جائے ان سے دوستی میں ہمیشہ اپنی غرض پیشِ نظر رہے۔ اور مکارانہ سیاست کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔

پانچواں اصول:۔ دل میں رقابت کی آگ ہر وقت مشتعل رکھی جائے۔ ہر ہمسائے سے جنگ جاری رکھی جائے اور اس جنگ میں انتہائی تشدد سے کام لیا جائے۔ حتیٰ کہ خود اپنے شہریوں کے مصائب و آلام کی بھی پرواہ نہ کی جائے۔

چھٹا اصول:۔ مخالفانہ پروپیگنڈہ، تخریبی کارروائیاں، ذہنی انتشار پیدا کرنے کی مہم، دوسرے ملکوں میں اپنے آدمی ناجائز طریق سے داخل کر کے فتنہ و کالم کی طرح یہ سب کچھ مسلسل کیا جائے۔

ساتواں اصول:۔ رشوت اور دوسرے ذرائع سے اقتصادی جنگ جاری رکھی جائے۔ دوسرے ملک کے آدمیوں کو خریدنے کی کوشش کی جائے۔

آٹھواں اصول:۔ امن کے قیام کا خیال بھی دل میں نہ لایا جائے خواہ ساری دنیا تمہیں اس پر مجبور کرے۔

یہ ہیں سیاسی اصول، اس قوم کے جس کے ساتھ (بدقسمتی سے) ہمیں بطور ہمسایہ واسطہ پڑا ہے۔

فغانِ من دلِ خلق آب کرد، ورنہ ہنوز
نہ گفتہ ام کہ مرا کار با فلاں افتاد

بیادِ محترم پرویز صاحب

امراضِ کہن کے لئے نسخہ کیمیا

استاذ المکرم محترم پرویز صاحب نے فرمایا تھا :-

- قرآن کریم قوموں کے امراضِ کہن کے لئے نسخہ کیمیا ہے۔
- اُن کا یہ کہنا یادِ خدا میں محو ہونے کے مترادف ہی نہ تھا بلکہ ان کے دل درد کی یہ ایک ایسی جھلک تھی جو قوم کے ظاہری و باطنی عوارض کا علاج تجویز کر رہی تھی اور یہ بتا رہی تھی کہ جسمانی و روحانی عروج کے لئے اگر کوئی ایسا علم دنیا میں اس وقت موجود ہے تو وہ قرآن کریم ہے۔
- قدیم و جدید عہد کے علماء و فضلا کے حسنِ کلام کی جتنی بھی چھان بین کی جائے اور جتنا وقت بھی ان تمام امور میں مصروف رہا جائے ہم اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اخلاق و تہذیب میں ــــ فرسودہ نقوش اور افعال کو چھوڑ کر ــــ کوئی بہتر چیز ہماری نظروں سے اگر گذرتی ہے تو وہ، حقیقت نگاری ہے جو قرآن کریم کے حوالوں سے ہم تک پہنچی ہے۔

فلسفہ و حکمت ہو یا فقہ و حدیث، علم نجوم ہو یا ہیئت و منطق، ریاضی ہو یا ہندسہ، اندازِ بیان وہی جانفزا ہے جو فکرِ قرآن سے عبارت ہے۔

علمی تحقیقات اور جدیدیت کے اس دور میں ہم جوں جوں شرعی امور میں غور کرتے جائیں یہ حساس جاگزیں ہوتا چلا جاتا ہے کہ اگر کوئی بات

۱۔ ہماری پسماندگی کے اس دور کو دور کر سکتی ہے۔

۲۔ مادیت اور رہبانیت کے تصورِ حیات کو دین کے تصورِ حیات میں بدل سکتی ہے۔

۳۔ وحدتِ انسانیہ کے تعمیری مقاصد کو پورا کر سکتی ہے۔

۴۔ انسانی صفات و اختیار کی نفی کو روک سکتی ہے۔

۵۔ قول و فعل کی سچائی پر زور دے سکتی ہے۔

۶۔ تاجداروں کے ظلم سے بچا سکتی ہے۔

۷۔ امراضِ نفسانیہ کا علاج کر سکتی ہے۔

۸۔ ادب و شائستگی کا سلوک عطا کر سکتی ہے۔

۹۔ شاعرانہ سحر کاری اور تخیل کو اعلیٰ رنگ دے سکتی ہے۔

۱۰۔ تاریخ و اذکار کو صحیح پرکھ سکتی ہے۔

۱۱۔ اصنافِ سخن کو حسین و جمیل بنا سکتی ہے۔
۱۲۔ افلاس و بے مائیگی سے نجات دلا سکتی ہے۔
۱۳۔ ذہن کے تخلیقی پہلوؤں کو محرّک کر سکتی ہے۔
۱۴۔ خوابوں کی دنیا سے نکال کر اصلیت کی طرف لا سکتی ہے۔
۱۵۔ شرعی احکامات کی تصدیق کر سکتی ہے
۱۶۔ ـــــــــــــــــــ
ـــــــــــــــــــ

تو وہ **قرآن کی فکر ہے۔**

- اور یہی وہ فکر ہے، اور یہی وہ فکر تھی جس پر اظہارِ دل سے پرویزؒ صاحب بات کرتے رہے اور سختی برداشت کرتے رہے۔
- مکتبِ مذہب نے فتاوائے مذہب سے ان کو ایسا نوازا کہ طبیعت کی روانی اور بڑھ گئی۔ مجروح قلب کی آواز اور بلند ہو گئی۔ گفتگو میں اور تبسّم آگیا۔ زورِ مضمون اور زیادہ ہو گیا۔ (قرآن) مشعل اتنی روشن ہوئی کہ ضلالت کی تاریکی چھٹ گئی۔ ہم خویش وہم بیگانہ کہنے لگے کہ یہ بزرگ دین کے پرستار تھے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تابع فرمان تھے، راست رو تھے، میرِ کارواں تھے۔

(حافظ) محمد یعقوب خان۔ تاجیک

بقیہ ذکر اللہ از صفحہ ۴۱

لئے رسول اللہؐ کی زندگی اُسوۂ حسنہ ہے۔ وہ اسی مکمل ترین احسن نمونے کی پیروی کرتے ہوئے مصروفِ تگ و تاز رہتے ہیں۔ (۳۳/۲۱) قرآنِ کریم سے ذکر اللہ کے بارے میں قلب و ذہن کو جو ابدی روشنی حاصل ہوتی ہے اس کی موجودگی میں کسی تشکیک و ابہام کی تاریکی جگہ نہیں پا سکتی لیکن :-

تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیئے

ہم ذکر اللہ سے وابستہ نہیں ہو سکتے۔ تاوقتیکہ اپنے قلب و دماغ میں جاگزیں بتوں کو پاش پاش نہ کر دیں۔ ذکر اللہ کو اپنانے کی یہی واحد صراطِ مستقیم ہے جس پر چلنے کے ہم مکلّف ٹھہرائے گئے ہیں۔ آیئے عمل کر قدم اٹھائیں۔

وَمَا تَوْفِيقِيٓ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ

(ثریا عندلیب)

حقائق و عبر

۱۔ پرویزؒ صاحب کی قرآن فہمی کو تسلیم کرنا ہی پڑا!

آج سے پورے ساٹھ سال پہلے محترم پرویزؒ صاحب نے سورۃ الفیل کی مقبول عام تشریح سے اختلاف کرتے ہوئے علمی طور پر یہ ثابت کیا تھا کہ ابرہہ کے حملے کے وقت اہل مکہ شہر چھوڑ کر پہاڑوں پر چلے گئے تھے، وہاں سے انہوں نے دشمن پر پتھراؤ کیا، جس نے دشمن کی فوج کا بھرکس نکال دیا اور پھر گوشت خور پرندوں نے ان کی نعشیں نوچتے اور کھاتے رہے۔ بعد میں سورۃ الفیل کی یہ تشریح ان کی مشہور کتاب معراج انسانیت میں شائع ہوئی تو علماء نے اس کے خلاف شور مچایا۔ لیکن آج انہی حضرات نے خود اس تفسیر کو اپنا لیا ہے۔ جناب جاوید احمد الغامدی اس بارے میں محترم امین احسن اصلاحی کی تحقیق ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:۔

"سورہ فیل کی عام تفسیر یہ ہے کہ ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میں یمن کا فرمانروا ابرہہ ساٹھ ہزار فوج اور تیرہ ہاتھی (بعض روایات کے مطابق نو ہاتھی) لے کر کعبہ کو ڈھانے کے لئے مکہ پر حملہ آور ہوا۔ اہل مکہ اس خیال سے کہ وہ اتنی بڑی فوج سے لڑ کر کعبے کو بچانے کی طاقت نہیں رکھتے، اپنے سردار عبدالمطلب کی قیادت میں پہاڑوں پر چلے گئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کے جنود قاہرہ پرندوں کی صورت میں اپنی چونچوں اور پنجوں میں سنگریزے لئے ہوئے نمودار ہوئے اور انہوں نے ابرہہ کے لشکر پر ان سنگریزوں کی بارش کر دی۔ چنانچہ یہ سارا لشکر منیٰ کے قریب وادی محسر میں بالکل بھسا ئے ہوئے بھوسے کی طرح ہو کر رہ گیا۔

اس سورہ کی جو تفسیر صاحب "تدبر قرآن" نے کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے اہل مکہ اس موقع پر، بے شک، پہاڑوں میں چلے گئے تھے۔ لیکن انہوں نے یہ اقدام مدافعت سے دست برداری کے لئے نہیں کیا تھا، بلکہ ابرہہ کی عظیم فوج کے مقابل میں دفاع کی یہی ایک شکل تھی جو وہ اختیار کر سکتے تھے چنانچہ حملہ آور فوج جب منیٰ کے قریب پہنچی تو انہوں نے پہاڑوں کی اوٹ سے سنگ باری کر کے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی اس جدوجہد

کے حملہ میں تند و تیز ہوا کے طوفان سے ابرہہ کی فوج کو اس طرح پامال کر دیا کہ وادی محسر میں گویا خود پرندے ان کی لاشیں نوچتے اور کھاتے رہے۔

اپنے اس نقطہ نظر کے مطابق سورہ کا ترجمہ انہوں نے اس طرح کیا ہے۔

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے خداوند نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ کیا ان کی چال بالکل برباد نہ کر دی اور ان پر جھنڈ کے جھنڈ چڑیاں نہ بھیجیں۔ تم ان کو مارتے تھے۔ سنگ گل کے قسم کے پتھروں سے بالآخر ان کو اللہ نے کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا۔"

(تدبر قرآن، جلد نہم، ص ۵۵۷)

۲۔ علماء کے نزدیک قرآن مجید کا مصرف

قرآن مجید کے بارے میں ہمارے تمام فرقوں کے علماء یہ دعوے کرتے ہیں کہ یہ مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ لیکن وہ اسے کس قسم کا ضابطۂ حیات سمجھتے ہیں؟ اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ وہ قرآن مجید کو کن مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں، اس کی ایک جھلک انہی کی زبانی ملاحظہ ہو:۔

"اگر کسی سنگ دل محبوب کو اپنا مطیع اور فرمانبردار بنانا ہو تو اس عمل کو بہ اعتقادِ صادق پڑھے، انشاء اللہ تعالیٰ جلد از جلد کامیابی ہوگی۔ عمل شریف یہ ہے۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ ط

ترکیب: مندرجہ بالا آیت شریف کو شروع چاند میں جمعرات یا پیر کے دن اعتقادِ صادق اور بہ نیت جائز صرف سات مرتبہ پڑھ کر پھولوں پر دم کرے یا شیرینی پر اور پھول یا شیرینی محبوب کو دے۔ اللہ کے حکم سے کامیابی ہوگی۔"

(ماہنامہ آستانہ نئی دہلی بابت اپریل ۱۹۸۹ء ص ۳۸)

یہ ہے ہمارے علماء کے نزدیک اسلام کے ضابطۂ حیات کا مصرف۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی عملی زندگی میں قرآن مجید سے رہنمائی حاصل کرنے سے قاصر رہ گئے ہیں۔

۳۔ علماء کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں

ہمارے ہاں مسلمانوں کے کئی فرقے ہیں۔ جو ایک دوسرے کو وقتاً فوقتاً کافر قرار دیتے رہتے ہیں۔ ان میں سے ہر فرقے کی اپنی علیحدہ سیاسی جماعت ہے۔ ظاہر ہے جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھے نماز نہیں پڑھ سکتے تو سیاست کیسے کر سکتے ہیں۔ لیکن اب علماء کے فرقہ وارانہ ذہن نے مزید ترقی کی ہے اور ہر فرقے کی سیاسی جماعت کے دو دو تین تین ٹکڑے ہو چکے ہیں۔ انہی میں سے ایک جمعیت علمائے اسلام ہے۔ اس جماعت کے دو ٹکڑوں کو متحد کرنے کے لئے، اس جماعت کے بانی مولانا حسین احمد مدنی صاحب کے صاحبزادے، ہندوستان سے تشریف لائے، لیکن علماء کے مختلف دھڑوں نے اپنے امام کے صاحبزادے کی ثالثی کی کوششوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے مشن کی ناکامی کے بارے میں جب جمعیت کے ایک دھڑے کے قائد سے پوچھا گیا تو انہوں نے نمائندہ چٹان کو بتایا:

> "میں نے جب مولانا فضل الرحمٰن سے جمعیت کے اتحاد کی حالیہ کوششوں کی ناکامی کا سبب پوچھا تو انہوں نے مصالحت کی حالیہ کوششوں کی تصدیق کی۔ تاہم انہوں نے ان کی کامیابی یا ناکامی پر کوئی تبصرہ کرنے سے انکار کیا۔ انہوں نے کہا کہ "مصالحت کے سلسلہ میں حالیہ مذاکرات انتہائی رازدارانہ انداز میں ہوئے ہیں اور ہم نے طے کیا ہے کہ اس مسئلہ پر ہونے والی گفتگو کو منظر عام پر نہیں لائیں گے۔ اور نہ ہی اسے اپنے اخباری بیانات کا موضوع بنائیں گے۔" جب میں نے بعض اخباری بیانات اور مضامین کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی تو انہوں نے کہا "اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ متوازی گروپ کے ذمہ دار افراد اپنے حامیوں کے ذریعے ہمارے خلاف من گھڑت اور بے بنیاد پراپیگنڈہ کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم اصلی معاملات سے پردہ اٹھانے پر مجبور ہوں گے اور جب ہم نے بات کی تو حقائق اس کے برعکس ہوں گے۔ جو متوازی گروپ پیش کر رہا ہے۔""

(ہفت روزہ چٹان بابت ۲۰ مارچ ۱۹۸۸ء صفحہ ۲۱)

۴۔ اخبارات کے رنگین ایڈیشن

اخبارات کے رنگین ایڈیشنوں کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں جو بے حیائی پھیل رہی ہے

اس کا نوٹس لیتے ہوئے ہفت روزہ الاسلام کے ایڈیٹر لکھتے ہیں:-

"آزادئ صحافت ——— کن معنوں میں بولا جاتا ہے۔ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اگر اس سے مراد یہی آزادی ہے جو اب اخبارات کو نصیب ہوئی ہے تو ہم اس آزادی پر تین حرف بھیجتے ہیں۔ اور اگر اس سے مراد غیر اخلاقی اور غیر ذمہ دارانہ رویے کا استیصال ہے، تو ہم مبدل وجان تائید کرتے ہیں۔

اخبارات کی موجودہ روش خصوصاً جب سے روزنامہ جنگ نے لاہور میں قدم رکھا ہے اور نوائے وقت سے معاصرت کی بنا پر انتہائی مکروہ ہے، کوئی دن خالی نہیں جاتا۔ جب صفحہ اوّل پر رنگین اور مختلف پوز میں فاحشہ عورتوں کی تصاویر ایسے زہد شکن انداز اور عریاں لباس میں چھپتی ہیں کہ غیرت ڈوب ڈوب جاتی ہے۔ کم از کم ہماری جرأت نہیں ہوتی صفحہ اوّل کو اپنی بہو بیٹیوں والے گھر میں داخل کر سکیں اس قدر بے غیرتی اور بے شرمی ہو رہی ہے کہ الامان والحفیظ پچھلے دنوں ایک اخبار میں مشہور ماہر نفسیات پروفیسر محمد سلیم کا مقالہ شائع ہوا جس میں انہوں نے واضح الفاظ میں کہا۔ کہ معاشرہ میں بے حیائی کی لہر اٹھانے میں سب سے زیادہ کردار اخبارات کے رنگین ایڈیشنوں نے ادا کیا ہے۔ یہ اخبار والے معاشرے میں بے حیائی کی چنگاری پھینک کر اپنی بچیوں کے ساتھ لمبی لمبی اور محفوظ کوٹھیوں میں محفوظ ہو جاتے ہیں جبکہ غریب لوگوں کی معصوم بچیاں جو گھر سے سودا سلف لانے اور پیدل سکول جانے پر مجبور ہیں۔ ان چنگاریوں سے ان معصوموں کی عزت خاک ہو جاتی ہے۔

ہم تو صرف ایک بات ہی پوچھنا چاہتے ہیں ——— کہ ایڈیٹر صاحبان! موجودہ بے ہودگی و بے حیائی کے ایڈیشنوں اور بے غیرتی کی اس نئی لہر کے بارے میں، آپ حضرات کی بہو بیٹیوں کے تأثرات کیا ہیں؟ کچھ کہو بھی ....

دل کو روؤں یا جگر کو پیٹوں میں

(ہفت روزہ الاسلام بابت ۱۱ مارچ ۱۹۸۹ء ص۵)

انہی اخبارات میں ہمارے علماء بھی بڑے فخر سے اپنی تصویریں شائع کراتے ہیں۔ بلکہ پچھلے دنوں ایک سروے کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ اکثر علماء حضرات یہی اخبارات خریدتے ہیں۔ اگر علماء حضرات واقعی ان اخبارات کے طرزِ عمل کو خلافِ اسلام سمجھتے ہیں تو پھر انہیں ایسے اخبارات کے بائیکاٹ کی مہم چلانی چاہیئے!

۵- فرقۂ اہلِ حدیث میں مزید انتشار

فرقہ اہلِ حدیث اپنے آپ کو قرآن و سنت کا واحد پرستار قرار دیتا تھا۔ لیکن مارشل لاء کے دوران اس فرقے کے کچھ لوگوں کو اقتدار کی جھلک نظر آئی تو یہ دو دھڑوں میں تقسیم ہو گیا جو دھڑا اقتدار سے محروم ہے اس کا لیڈر ایک سال پہلے قتل ہو چکا ہے۔ جس کے قاتل ابھی تک گرفتار نہیں ہو سکے۔ ان قاتلوں کی گرفتاری کیلئے اس دھڑے نے مہم چلائی۔ ان کی مہم کے نتیجے میں حکومت نے اس دھڑے کے لیڈروں کو بات چیت کی دعوت دی جسے ایک اعزاز سمجھا گیا۔ حکومت سے بات چیت کے لئے جس وفد کا انتخاب کیا گیا اس کے بارے میں خود اس دھڑے کے لیڈروں میں سر پھٹول شروع ہو گئی اور انہوں نے ایک دوسرے پر اخبارات کے ذریعے سنگین الزامات لگائے۔ ان الزامات، کی ایک جھلک خود انہی کی زبانی ملاحظہ فرمایئے:-

"اس ضمن میں احتجاجی گرفتاریوں کی تحریک کے التوا اور وزیر اعلیٰ پنجاب سے جمعیت کے مذاکرات کو بہانہ اور آڑ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ (ا) گرفتاریوں کی تحریک ہماری احتجاجی تحریک کے پہلے راؤنڈوں کی طرح جمعیت اہلِ حدیث کے مالی اور افرادی تعاون سے چلی (ب) مذاکرات کے بعد ہمارے شہداء کے بہیمانہ قتل کی تفتیش جو سرد خانہ کی نظر ہو چکی تھی از سر نو بڑی سرگرمی سے شروع ہوئی۔ (ج) جمعیت اور یوتھ فورس کے محدود وسائل کے باوجود اس تحریک سے تفتیشی مقاصد میں اہم پیش رفت بھی حاصل ہوئی اور تحریک بھی باعزت طور پر ملتوی ہوئی اور یہ دونوں باتیں موجودہ حالات میں ایک نمایاں کامیابی کی حیثیت رکھتی ہیں (د) قاضی عبدالقدیر نے اس تحریک کی منصوبہ بندی اور اس کو چلانے میں بہت نااہلی کا ثبوت دیا۔ اور اگر جمعیت کے قائدین اسے نہ سنبھالتے تو وہ نہ چل سکتی تھی اور نہ کسی نتیجہ پر پہنچ سکتی تھی۔ (ہ) قاضی عبدالقدیر اس تحریک کے دوران اکثر و بیشتر روز غیر حاضر رہے اور متعدد مرتبہ اس بات پر گھبراہٹ اور مایوسی کا اظہار کیا کہ حکومت ہم سے مذاکرات کی طرف رجوع ہی نہیں کرتی۔ مگر جب مذاکرات ہوئے تو صرف اس وجہ سے کہ انہیں مذاکراتی ٹیم میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ انہوں نے قائدین جمعیت کو نشانہ طعن و تشنیع بنا لیا۔ (و) اور انہیں مذاکراتی ٹیم میں اس لئے شامل نہ کیا گیا تھا کہ وہ جب حکومت نے بار بار مذاکرات کی پیشکش کی تو وہ تحریک کو چھوڑ چھاڑ کر سندھ میں اپنے استقبالیہ جلسوں اور جلوسوں کے دس روزہ پروگرام میں مشغول تھے اور مذاکرات کے موقع پر واپس آئے تھے جبکہ مذاکراتی ٹیم کے نام حکومت کے پاس پہلے ہی جا چکے تھے۔ نیز وہ اس وقت قائدین پر علی الاعلان اور پبلک طور پر طعن و تنقید کرنا شروع کر چکے تھے۔"

(ہفت روزہ الاسلام بابت ۱۱ مارچ ۱۹۹۸ء صفحہ ۵)

۶۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی مولوی حضرات سے مایوسی

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مولویوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے اپنی علمی سطح سے بھی نیچے اتر آئے تھے۔ یہاں تک کہ انہیں خوش کرنے کے لئے انہوں نے عائلی قوانین کی مخالفت بھی شروع کر دی وہی عائلی قوانین جنہیں مودودی صاحب نے کسی زمانے میں اپنی کتاب "حقوق الزوجین" میں پیش کیا تھا تو ڈاکٹر صاحب نے انہیں علمی تحقیق کا نادر نمونہ قرار دیتے ہیں۔ اب وہ اپنے ماہنامہ "حکمت قرآن" کی تازہ اشاعت میں ان علماء کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"اور اگرچہ ــــــ ایک جانب ہماری سوچی سمجھی رائے، جسے ہم نے پہلے بھی برملا بیان کیا ہے۔ یہ ہے کہ جہاں تک عہدِ حاضر میں احیاءِ ملّت اور دین کے غلبہ و اقامت کی جدّوجہد کا تعلّق ہے۔ اس کے تقاضے پورے کرنا قدیم مذہبی حلقوں کے بس کا روگ نہیں ہے، اس لئے کہ علماءِ سوٗ سے قطع نظر، طبقۂ علماء کے "خیار" سے بھی زیادہ سے زیادہ اعتقادی فتنوں سے استیصال اور بدعات و رسومات کی بیخ کنی یعنی اسلام کے صحیح عقائد اور کم از کم تعبّدی امور کی حد تک صحیح عمل کی حفاظت و مدافعت ہی کی توقع کی جا سکتی ہے ــــــ رہے حلقہ ہائے تصوف تو ان کے ضمن میں اس افسوسناک حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ فی الوقت ان میں سے اکثر و بیشتر ــــــ "مست ذوقِ ذکر و فکرِ صبحگاہی ہیں اسے"! ــــــ اور "پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے"! ہی کی روش پر عمل پیرا ہیں۔ گویا ع "بانشۂ درویشی در ساز و دمادم زن"! پر تو عمل کر رہے ہیں لیکن ع "چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن" کا کوئی پروگرام ان کے حاشیۂ خیال تک میں موجود نہیں ــــــ لہٰذا اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور دینِ حق کے غلبہ و اقامت کی جدوجہد کے آگے بڑھنے کا اگر کوئی امکان ہے تو صرف ان احیائی تحریکوں ہی کے ذریعے ہے۔"

(ماہنامہ حکمتِ قرآن بابت مئی ۱۹۸۸ء)

۷۔ یہ اُمّت کیلئے لڑنوائے علماء

ہمارے علماء کے بارے میں مدینہ منورہ سے سید مزمّل حسین پوسٹ بکس نمبر ۲۰۴۴ کا ایک مراسلہ روزنامہ نوائے وقت لاہور کی ۸ مئی ۱۹۸۸ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ جسے بلا کسی تبصرے کے قارئین

طلوع اسلام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

مکرمی! سانحۂ راولپنڈی پر ہم شدید غم میں مبتلا ہیں۔ پتہ نہیں غریب لوگوں کو کس کی سزا ملی؟ پاکستان میں جو بھی مصیبت آتی ہے، وہ بیچارے غریبوں پر آتی ہے۔ سرمایہ دار اور امیر محفوظ رہتے ہیں۔ پاکستان کے حکمرانوں کو غریبوں کی مشکلات کا احساس تبھی ہو سکتا ہے جب ان میں سے کسی کا کوئی عزیز حادثے میں رخصت ہو جاتا۔ بیرونِ ملک مقیم لوگ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ آئندہ تمام احتیاطی تدابیر اختیار کر کے ایسے حادثات کی روک تھام کی جائے۔

روزنامہ نوائے وقت کی ایک اشاعت میں ایک باتصویر خبر چھپی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ لاہور میں علماء کے دو گروپ اس وقت آپس میں جھگڑ پڑے، جب راولپنڈی کے سانحہ میں جاں بحق ہونے والوں کی نمازِ جنازہ ہو رہی تھی۔ اس موقع پر ہاتھا پائی ہوئی اور نمازِ کو اپنی شہرت کا ذریعہ بنایا گیا۔ اس صورت حال پر ہم اتنی بات ہی کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کے علماء کو پہلے اپنی تربیت کرنی چاہیے۔ یہ دو رکعت کی امامت کے لئے آپس میں لڑ لڑ کر قوم کو اسلام کی منزل سے دور کر رہے ہیں۔ فی الوقت ان پر عالم ہونے کی تہمت لگائی گئی ہے۔ لفظ 'مولانا' استعمال کر کے حقیقت میں کوئی عالم نہیں بن جاتا۔ قرآن و سنت کو سمجھنے کے لئے اخلاص کے ساتھ گہرے مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلام کو اپنی شہرت کا ذریعہ بنانے والوں کو وہ وقت یاد کرنا چاہیے، جب قیامت کا دن ہو گا اور ایک عالم خدا کے سامنے پیش ہو گا اور خدا سے عرض کرے گا کہ اے میرے رب! میں نے تیرے دین کا علم سیکھا اور اس کو دوسروں تک پہنچایا۔ اس پر خدائے تعالیٰ کی جانب سے اشارہ ہو گا کہ تم نے جھوٹ بولا، تم نے دین کا علم شہرت کے لئے سیکھا تھا۔ تم یہ چاہتے تھے کہ لوگ تمہاری تعریف کریں۔ سو تمہاری تعریف دنیا میں ہو چکی، اب تمہارے لئے جہنم کے سوا کوئی مقام نہیں اور پھر فرشتوں کو حکم ہو گا کہ اسے گھسیٹتے ہوئے جہنم میں پھینک دو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ پاکستان کے علماء کی اصلاح کرے۔ اس لئے کہ قوم کی اصلاح علماء کی اصلاح کی مرہونِ منت ہے۔"

(روزنامہ نوائے وقت لاہور، بابت ۸ مئی ۸۸ء صفحہ ۱۱)

۸۔ علامہ اقبال اور علماء

ہر سال کی طرح اس سال بھی یومِ اقبال ۲۱ اپریل ۸۸ء کو الحمراء آرٹ سینٹر میں منایا گیا۔ اس موقع

پر تقریر کرتے ہوئے، علامہ صاحب کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"علامہ اقبال کٹھ ملائیت، سلطانیت، علاقائیت اور منفی قسم کے تصوّف کے خلاف تھے اور علامہ کے نزدیک سلطانیت سے مراد مطلق العنانی اور آمریت تھی اور وہ محسوس کرتے تھے کہ مسلمانوں کی بقاء اور استحکام جمہوریت سے ہے۔ انہوں نے کہا کہ علامہ اقبال کٹھ ملائیت کے خلاف تھے وہ کہتے تھے کہ کٹھ ملاؤں کے وجود سے اجتہاد کا عمل رک گیا ہے اور فرقہ پرستی نے جنم لیا ہے۔ ان کی نظر میں علمائے کرام کی بے حد قدر و منزلت تھی اور اسی وجہ سے علامہ سیّد سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ کو عالم کل قرار دیتے تھے۔

انہوں نے کہا کہ اسلام نماز روزے کا نام تو نہیں اور پاکستان کے موجودہ حالات میں آج بھی کوئی روٹی کی بات کرتا ہے اس پر کفر کے فتوے لگائے جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ تعزیری قوانین نافذ کرنے سے اسلام نافذ نہیں ہو سکتا بلکہ اس وقت تک جو تعزیری قوانین نافذ کیے گئے ہیں ان سے ابہام پیدا ہوا ہے۔ دراصل یہ اسلامائزیشن نہیں بلکہ منافقت ہے"

(ہفت روزہ چٹان بابت ۲۸ اپریل صہ ۱۹)

۹۔ علمانے بھی دینِ اسلام کو فٹ بال بنا رکھا ہے۔

حال ہی میں جماعت اسلامی کے سابق امیر میاں طفیل محمد صاحب اس عوامی تاثر کو کہ جماعتِ اسلامی مارشل لاء کی بی ٹیم رہی ہے، کو ختم کرنے کے لیے موجودہ حکمرانوں پر تنقید کی کہ انہوں نے شریعت اسلامی کو فٹ بال بنا رکھا ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ہفت روزہ چٹان اپنی ۲۸ اپریل ۸۸ء کی اشاعت میں لکھتا ہے۔

"میاں محمد طفیل کا ارشاد کہ حکمرانوں نے شریعت کو فٹ بال بنا رکھا ہے اس میں حقیقت سے زیادہ غلط بیانی نظر آتی ہے، بلاشبہ حکمرانوں کا طرزِ عمل اس معاملے میں چنداں قابلِ رشک نہیں لیکن اونٹ کی کمر پر آخری تنکا علماء کرام کا رویہ ہے حکمران اگر دین اور شریعت کو فٹبال بناتے ہیں تو یہ ان کا مفاد ہے کہ وہ اس معاملے میں حکمرانوں سے بھی دو قدم آگے ہیں میاں طفیل محمد خود دیانتداری سے بتائیں کہ شریعت بل کو 'شرارت بل' کس نے کہا؟ "ہمیں شریعت چاہیے بل نہیں" یہ پھبتی حکمرانوں کی ہے یا حضرات علماء کرام کی؟

"ہم آخری دم تک مزاحمت کریں گے" یہ دھمکی ارباب اقتدار کی ہے یا جبہ و دستار کی تھی ہ ہمیں الغنڈ مذ فقہ اور راور شریعت منظور نہیں" شریعت بل پہ یہ تو کردہ تبصرہ حکومت کا ہے یا علماء کرام کا میرے خیال میں مندرجہ بالا تمام تبصرے آج بھی میاں صاحب کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہوں گے لیکن پھر بھی ان کا ارشاد ہے کہ شریعت کو حکمرانوں نے فٹ بال بنا رکھا ہے۔

- پہلے ہمیں اپنے گھر کی خبر لینی چاہیے پھر دوسروں کی ڈیوڑھی میں جھانکنا اچھا لگتا ہے۔ اگر یہی علماء رہے تو اس ملک میں انگریز کا قانون جاری رہیگا۔ یہاں کمیونسٹ انقلاب آسکتا ہے سیکولر سسٹم جڑ پکڑ سکتا ہے مگر اسلامی انقلاب اور اسلامی نظام نہیں آسکتا کیونکہ علماء کرام کی تفرقہ طرازی نے ان کی رائے، سوچ، فکر، قوت، عمل، زاویۂ نظر سب کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ سنی شیعوں کے منہ پر اسلام دے مارتے ہیں اور شیعہ سنیوں کے منہ پر، مقلدین کا اسلام الگ ہے اور غیر مقلدوں کا علیحدہ"۔

(ہفت روزہ چٹان لاہور بابت ۲۸ اپریل ۸۸ء صفحہ ۴۳، ۴۴)

۱۰۔ خطبہ حجۃ الوداع

ہمارے ہاں خطبہ حجۃ الوداع کا جو متن مروج ہے۔ وہ حدیث کی کسی کتاب میں نہیں ملتا۔ ان کتابوں میں اس خطبے کے صرف چند کلمات ملتے ہیں۔ آپؐ نے یہ خطبہ ایک لاکھ سے زائد صحابہ کے سامنے دیا تھا دوسرے الفاظ میں اس کے راویوں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود کتب احادیث میں اس کا سرسری سا ذکر ملتا ہے۔ اس کے بارے میں ہم نے اہلحدیث حضرات سے درخواست کی تھی کہ وہ خطبہ کے مروجہ متن کی کسی حدیث کی کتاب میں نشاندہی فرما دیں۔ ہماری اس درخواست کے جواب میں ارشاد ہے۔

یہ تو ابھی تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے کہ خطبہ حجۃ الوداع پر مشتمل حدیث کو آپ نے عجمی سازش کہہ کر اس کا مذاق اڑایا تو ہم نے آپ ہی کے من بھاتے قاعدے کے تحت اس خطبے کی مطابقت قرآن کریم سے ظاہر کر دی اب چاہیے تو یہ تھا کہ آپ اسی جگہ واپس آجاتے جہاں سے آپ کا قدم غلط سمت میں اٹھا تھا اور از سر نو اپنا سفر شروع کرتے لیکن اس کے برعکس آپ نے اپنی ٹیڑھی روش پر ضد کا اظہار یوں کیا کہ:

"اس ایک لاکھ سے زائد راویوں والی حدیث کا صحیح متن کیا ہے؟"

طلوعِ اسلام جنوری ۸۸ء

مقامِ غور ہے کہ خطبہ حجۃ الوداع کے ہر ہر جملے کی قرآنی تعلیمات سے مطابقت ثابت ہو جانے کے بعد بالخصوص آپ کو یہ زیب دیتا ہے کہ اس پر اعتراض کریں؟ کیونکہ آپ کے ہاں تو حدیث کی صحت کو جانچنے کا اصول ہی یہ ہے کہ وہ قرآنی تعلیمات کے مطابق ہو۔

لہٰذا دوبارہ ہم یہ واضح کیے دیتے ہیں کہ خطبہ حجۃ الوداع کی حدیث کا وہی متن صحیح ہے جس کی قرآنی تعلیمات سے مطابقت آپ پر واضح کی جا چکی ہے۔"

ہم نے حجۃ الوداع کے مروجہ متن کے بارے میں عجمی سازش کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔ یہ اہلحدیث حضرات غلط بیانی سے ہمارے نام تھوپ کر اصل مسئلہ سے توجہ ہٹانے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ ہمارا سوال بڑا سادہ سا ہے کہ اس سب سے زیادہ راویوں والی حدیث کا اصل متن کیا ہے اور وہ حدیث کی کونسی کتاب میں دستیاب ہے۔ براہِ کرم کیچڑ اچھالنے کی بجائے اس سادہ سے سوال کا جواب دیجئے۔

۱۱۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا محترم پرویز صاحب کو خراجِ عقیدت

طلوعِ اسلام بابت اپریل ۱۹۸۸ء کے حقائق و عبر میں عنوانِ بالا سے "پرویز اور قرآن" نامی کتاب پر ماہنامہ حکمت قرآن میں تبصرہ پر مؤاخذہ کیا گیا تھا اور ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے علم میں اضافہ کی غرض سے ان کی توجہ اس طرف دلائی گئی تھی کہ محترم پرویز صاحب برٹش حکومت کے محکمہ انفارمیشن میں نہیں بلکہ ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ جس حیثیت کو انہوں نے تحریکِ حصولِ پاکستان کی کوششوں میں بھرپور طریقہ سے استعمال کیا۔

اب ناظم اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن کی طرف سے یہ وضاحت موصول ہوئی ہے کہ گو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بحیثیت مدیر مسئول اس رسالہ میں شائع ہونے والے مواد کے لئے ذمہ دار ہیں لیکن اس تحریر کو ان کے ذاتی نام سے منسوب کرنا درست نہیں کیونکہ یہ اُن کی تحریر نہیں۔ قارئین کرام نوٹ فرمالیں۔

نقد و نظر

نام کتاب ۔ "پرویز اور قرآن"
(المعروف قرآنی پاکٹ بک مشمل احمدیہ پاکٹ بک)
مولف ۔ حضرت علامہ مفتی مدرار اللہ مدرار نقشبندی مدظلہ ۔ ڈسٹرکٹ خطیب مردان
ناشر ۔ اکرام اللہ شاہد ایم اے
عمدہ کتابت ۔ اعلیٰ طباعت ۔ گھٹیا زبان ۔ قیمت ۳۰ روپے

مولف کا دعوے ہے کہ انہوں نے پرویز کی ہزار ہا صفحات پر پھیلی ہوئی جملہ کتب کا استیعابی مطالعہ کر کے اس کتاب میں پرویز کے غیر قرآنی عقائد و نظریات سے پردہ اٹھایا ہے ۔ یہ دعوے از خود محل نظر ہے کیونکہ پرویز صاحب کی کتب تو درکنار حضرت علامہ مفتی مدرار صاحب نے مجلہ طلوع اسلام کا ہی مطالعہ کیا ہوتا تو وہ پرویز مرحوم کو کیمونسٹ مادہ پرست، تارک الصلوٰۃ اور منکر ختم نبوت قرار دینے کا تصور بھی نہ کر پاتے ۔ تاہم اگر انہوں نے جملہ کتب کے مطالعہ کے بعد ایسا کیا ہے تو افترا پردازی اور دشنام طرازی میں علامہ مفتی صاحب کی دیدہ دلیری بے مثال ہے

مؤلف نے اپنی کتاب میں پرویز صاحب کی پیش کردہ فکر قرآنی سے جن معاملات میں اختلاف فرمایا ہے ان میں کچھ معاملات کا تعلق تاریخ، فلکیات، طبعیات اور غیر مرئی حقائق سے ہے ۔ ان علوم کے فنی غوامض اور اصطلاحی رموز سے مولف کی بے بصری کتاب میں پیش کردہ ان کی تاویلات سے ظاہر ہے باقی معاملات میں بیشتر سے

ابن مریم مرگیا یا زندہ جاوید ہے

قسم کے ہیں جنہیں زیر بحث لانا شاید قارئین پر گراں گزرے ۔ علامہ مفتی مدرار صاحب کی طرف سے دو اعتراضات ایسے ہیں جن کا تجزیہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا ۔ فرماتے ہیں :۔

پرویز کی یہ بات کس قدر لغو اور گمراہ کن ہے کہ رسول اللہ اس قانون کا انسانوں تک صرف پہنچانے والا ہے اور اسے بھی کوئی حق نہیں کہ وہ کسی پر اپنا حکم چلائے ۔

ہم کہتے ہیں پرویز کو یہ حق کس نے دیا کہ آنحضرتؐ کی شانِ اقدس میں اس قسم کی بات کہے جو سنگین محذورات کی حامل ہے۔

حضرت علامہ مفتی صاحب یقیناً یہ جانتے ہونگے کہ یہ الفاظ جنہیں حضرت علامہ مفتی صاحب لغو اور گمراہ کن قرار دے رہے ہیں پرویزؔ کے نہیں اللہ تعالےٰ کے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

ترجمہ:- ۳:۷۹

ایک بشر کے لئے یہ جائز نہیں کہ اللہ تو اسے کتاب و حکمت و نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کی بجائے میرے محکوم بن جاؤ۔ بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ تم سب اللہ والے بن جاؤ اس لئے کہ تم کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور اسی کو پڑھتے بھی ہو۔

ترجمہ:- ... ۹:۱۹

...اور خدا نے صرف یہ قرآن مجھ پر وحی کیا ہے تاکہ میں تمہیں اسی کے ذریعے متنبہ کروں۔

۴:۱۰۵ ...

بے شک ہم نے تجھ پر حق و صداقت پر مبنی کتاب نازل کی تاکہ تو احکام الٰہی کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے...

الا ان الحکم الا للہ

اس کے باوجود حضرت علامہ مفتی اگر یہ فرماتے ہیں کہ "اس منکرِ رسالت کو معلوم ہونا چاہیے کہ از روئے قرآن رسول اور پیغمبر کا مقام ہی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اپنا اتباع اور اپنے حکم کی اطاعت کرائے تو کوئی کیسا کر سکتا ہے۔ انہیں دراصل یہ کہنا چاہیے تھا کہ "خدا کو معلوم ہونا چاہیے"۔

حضرت علامہ مفتی صاحب کا یہ کہنا کہ ایمان بالرسول کا یہ مطلب نہیں کہ رسول کو چٹھی رساں کی حیثیت دی جائے بالکل درست ہے پرویزؔ صاحب نے بھی اپنی کتاب "معارف القرآن" میں جس سے حضرت علامہ مفتی صاحب نے بھی کسب ضیا کیا ہے اس سے ملتے جلتے الفاظ لکھے ہیں فرماتے ہیں:-

"رسول کے ذمے صرف پیغام پہنچا دینا ہی نہیں (جیسے چٹھی رساں کے ذمے چٹھی پہنچا دینا ہوتا ہے) بلکہ وہ اس تعلیم خداوندی کو ایک عملی نظام معاشرہ کی صورت میں متشکل کر کے اس کے درخشندہ نتائج اور خوشگوار ثمرات کو وحیٔ خداوندی کی صداقت کے لئے بطور دلیل پیش کرتا ہے اور اس طرح لوگوں کو مشہود طریقے پر بتا دیتا ہے کہ یہ تعلیم ناممکن العمل نہیں، تم نے بھی اسے اسی طرح کے نظام کی شکل میں آگے چلانا ہے"

پرویز صاحب کے خلاف حضرت علامہ مفتی مدرار صاحب کا دوسرا بڑا اعتراض یہ ہے کہ "ارض اللہ سے پرویز نے یہ مطلب لیا ہے کہ زمین خدا کی ہے جس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ یہ مطلب سراسر لغو اور باطل ہے۔

آرضِ اللہِ ۶۴:۱۱ اللہ کی زمین ــــــ ۲:۲۹ زمین کے اندر جو کچھ بھی (سامانِ زیست) ہے وہ تمام نوعِ انسان کے فائدے کے لئے ــــــ ۷:۱۰ اس میں سب کے لئے سامانِ معیشت ہے ــ ۲۰:۵۴ اس میں سے خود بھی کھاؤ اپنے مویشیوں کو بھی کھلاؤ ــــــ ۵۵:۱۱ زمین خدا کے بندوں کے لئے ذریعۂ رزق ہے ــــــ ۲:۲۸۴ ارض و سما میں جو کچھ ہے وہ خدا کی ملکیت ہے اور پھر حق تعالیٰ ــــــ ۲:۱۲۲ فرما دینے کے بعد خلقِ خدا کو زمین سے ثمرات اور رزق حاصل کرنے کا حق تو مل جاتا ہے، لیکن حقِ ملکیت میں خدا کی ہمسری کا دعوے حضرت علامہ مفتی مدرار اللہ اور ان کے ہمنوا ہی کر سکتے ہیں۔

اپنی کتاب میں علامہ مفتی صاحب نے جابجا علامہ اقبالؒ کے اشعار کا سہارا لیا ہے لیکن علامہ مفتی ملکیت زمین کے موضوع پر حکیم الامت کی یہ دلنشین نظم اپنی کتاب میں نقل فرمانا شائد بھول گئے جو اس موضوع پر قولِ فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

حق زمیں را جز متاعِ ما نہ گفت
ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
باطنِ "ارض اللہ" ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است
رزقِ خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاعِ بندہ و ملکِ خدا است
ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ
تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ

اور

ارضِ حق را ارضِ خود دانی بگو
چیست شرحِ آیۃ "لا تفسدوا"

آخر میں حضرت علامہ مفتی مدرار صاحب جناب اکبر الہ آبادی کی زبان میں فرماتے ہیں۔

بقیہ صفحہ ۶۴ پر

appreciation of the blessings of good government - these are the objects which the founders of the college have prominently in view."[12] This address precisely and comprehensively summarises all that Syed Ahmed stood for as an educationist.

With this tremendous responsibility that he had selfimposed upon himself, he decided to resign from his job so that he could devote all his time to the project that was so dear to his heart.

- continued -

12 Graham - "Syed Ahmed Khan" pages 180-183.

Syed Ahmed had to meet some difficulties before the foundation of the college was laid. He was very keen to ultimately establish a University which would be controlled by the Muslims them selves and free from state control. But the British Government refused to give a grant-in-aid for a university. This was a set-back to his plans, but true to his personality he decided to do whatever was possible and whatever was permissible for the time being.[10] The second difficulty was allotment of land in Aligarh. The Collector of the area and the British community opposed it. For a moment it seemed as if the whole scheme would have to be shelved. But the matter was soon sorted out by the new Lieutenant-Governor and the parade ground in the Cantonement was allotted on two conditions. Firstly, that the building plans must have previous sanction of the Government. Secondly, if the college closed, the land and the buildings would revert to the government without compensation. Syed Ahmed consented to these conditions.

Having overcome these obstacles within their limitations, the foundation of the school was laid in 1875 as a stepping-stone towards the college. This school was soon visited by Sir William Muir who reiterated the government policy in giving support to the secular learning, but a Christain government could not inculcate Hindu or Islamic tenets.[11] It was hoped by Syed Ahmed that the Viceroy, Lord Northbrook would be able to lay the foundation stone of the college. But he returned to England in the meantime and this function was performed by his successor, Lord Lytton in 1877. The inaugural address read by Syed Mahmud is worth quoting: "The College, of which your Excellency is about to lay the foundation-stone," he said, "differs in many important respects from all other educational institutions which this country has seen. There have been others built by sovereigns and supported by the revenues of the state. But this is the first time in the history of the Muhammadans of India that a college owes its establishment, not to the charity or love of learning of an individual, not to the splendid patronage of a monarch, but to the combined wishes and the united efforts of a whole community. It has its origins in causes which the history of this country has never witnessed before." The aim of the college was, he explained, "to dispel those illusory traditions of the past which have hindered our progress; to remove those prejudices which have hitherto exercised a baneful influence on our race; to inspire in the dreamy minds of the people of the East the practical energy which belongs to those of the west; to make the Mussaimans of India worthy and useful subjects of the British Crown; to inspire in them loyalty which springs, not from servile submission to a foreign rule, but from genuine

10 The Aligarh College became a university in 1920 but only after a great deal of struggle, and then too it was not free of state control.

11 Graham - "Syed Ahmed Khan" pages 165-166.

and geographical Aligarh became the venue of the grand project. It was a small town, but Syed Ahmed believed that like "little towns of Oxford and Chambridge" Aligarh will become more famous than bigger cities of India, for example, Delhi.

Perhaps one of the most challenging aspect of the scheme was raising of funds. A "Muhammadan Anglo-Oriental College Fund Committee" was formed, with branches in small and big towns of the country. Syed Ahmed enjoined upon friends whereever they may be to open sub-branches and help in collecting funds. It taxed all his ingenuity and resourcefulness to get money out of his people. He tried everything from lottery to personal appearance on the penny-reading theatre. Details given by Hali present a real saga of determination and enthusiasm and resourcefulness. These details may not detain us here. What needs to be emphasised is that Syed Ahmed had to begin from scratch. The Muslims did not appreciate the value of western education and were loath to spend on it. They wasted whatever money they had on useless customs and ceremonies, on fabulous clothes and houses. All this pained Syed Ahmed and there are copious references to it in his speeches and articles. He regretted that in spending money they had no sense of discrimination. They spent lavishly and willingly on wedding gifts for their children and on other foolish customs, even mortgaged property, but grudged spending on education and knowledge. Yes, generous they were, but it was a misplaced generosity, they were also selfish. They spent lacs of rupees on mosques, tombs, 'amambaras' 'Khankas' and charity meals, to guarantee for themselves pearl-studded palaces in heaven. This was business, pure and simple and must be condemned. There was no service other than service to the people. Besides all this, the Muslims, as we have discussed already in Chapter I were an impoverished people economically, and to make matters worse, the Resumption of Land and forfeiture of educational trusts proved fatal to Muslim education.[8] In the medieval Muslim set-up, devoting a little time to a few pupils and imparting knowledge was more a religious duty than a salaried job as a government employee. The custom was for the state to assign land to schools and colleges. Wealthy individuals did the same. Thus the Educational Trusts were a source of vast income which had now been taken over by the Government. But no alternative arrangements were made for Muslim education that could attract their interest. Hunter admitted that "the English in India have failed in their duty towards the Mussalmans......"[9] In all these circumstances to manage to build grand edifices, recognised by visitors as probably the grandest in India is no easy achievement.

8 See Appendix II.

9 W Hunter - "The indian Mussalmans" page 170.

learning by rot, there were not enough teachers and of course English as medium of instruction presented difficulties. He found many objections due to prejudice, but on the whole it was true that the government system of education was not adequate to meet the needs of the Muslims, even if some changes were made in it. Thus his most far-reaching and momentous conclusion was "that if the Muslims wished to preserve their ancient learning, to profit from modern arts and sciences, and to impart to their children an education adequate to meet both their spiritual and material needs, there was no course open to them but to divise an educational system of their own."[7] Here was his principle of self-help in which he believed as an article of faith for the rest of his life. He used to say that self-help is better than thousands of efforts made by the government. To him it was pathetic and disgraceful that the Indians should look upto the government for every detail, even their children's education. Indians ould progress only when they organised education themselves with their own funds, their own administration and their own efforts without the interference from the government. Of course, it is the government's duty to cooperate through their system of grants-in-aid, but no more. This is as it should be because the government could not fulfil the peculiar needs of the varied population of India.

The next step was to put forward a scheme for the establishment of Muhammadan-Anglo-Oriental University, which was in keeping with his analysis: that is, there should be teaching of western arts and sciences along with religious instruction for Muslims. The college was to have three sections: (1) Teaching of western learning through the medium of English. (2) Teaching of western learning through the medium of urdu. (3) Teaching of oriental learning in Arabic and Persian. Above all religious instruction was to be cumpulsory in all the sections. Copies of this scheme were sent to the provincial governments and the central government. The response from them all was very encouraging; the only condition they put forward was that their cooperation and financial aid would be only for the western sciences and arts, in other words, only for secular courses. Indeed, Syed Ahmed found this to be in the fitness of things, for he would prefer that Muslims themselves were entirely responsible for their own peculiar needs, needs that were different from other sections of the population. The letters received from the provincial or local and central governments greatly strenghened the position of the "Committee for the Advancement of Learning among Muslims."

The site for the proposed university was also decided on the basis of a questionaire circulated among the people. For various reasons, cultural, climatic

7 Altaf Hussain Hali - "Hayate-Javaid" page 226.

down prejudices and barriers against western education, he was also taking practical steps in the realisation of his plans to establish a college, for it was after all a college that was going to be the focus of his movement to change the outlook of his people.[5]

Accordingly Syed Ahmed organised a "Committee for the Advancement of Learning among Muslims." The objective of the committee was to ascertain from the Muslims themselves as to what were the genuine objections they had in admitting their children to the numerous government schools and colleges that had sprung up in the wake of the new educational policy, evolved gradually since the year 1813. The Committee announced an essay competition on this theme, that is, why Muslims were not benefitting from western education, and for the three best essays there were to be prizes of five hundred, three hundred and one hundred and fifty rupees.

To Syed Ahmed the first meeting of the Committee was a crucial one. He wondered whether he would be able to motivate a people suffering from apathy tantamount to a mental disease.[6] However, the response was not as bad as he thought it would be. Altogether, thirty two essays were received by the Committee. Mahdi Ali's was adjudged the best but he declined to take the prize. After a careful perusal of the essays, Syed Ahmed summarised the Muslim objections to western education and came to some definite conclusions. The main objections to western arts and sciences were: (1) There was no religious instruction in government schools and colleges (2) Western education undermined and subverted religious beliefs. (3) They had prejudice against learning from non-Muslim teachers. (4) Their own peculiar morals and manners were corrupted. (5) Text books often contained material that was prejudicial to Islam. (6) The method of teaching was defective - there was emphasis on

---

5 Syed Ahmed had already communicated his scheme for circulation to Mahdi Ali from London. But Mahdi Ali had put it safely in a box saying that everybody is not a Syed Ahmed to be able to accomplish such projects - A.H.Hali - "Hayate-Javaid" page 223.

6 "I arrived at Syed Ahmed's house", Mahdi Ali told Hali, "a day before the inaugural meeting of the Committee, and slept in the same room with him. He talked until midnight about the education of the Muslims, after which I went to sleep. Waking suddenly at about two o'clock in the morning, I found Syed Ahmed missing from his bed. So I went out of the room to look for him. Imagine my surprise at finding him walking up and down the veranda and crying as if his heart would break. "Sad news from somewhere?" I asked anxiously. "No sad news", he replied, crying the more profusely, "but what could be sadder than to think of the Muslims condition? It is getting worse every day, and I see no prospects of its ever improving." Then he added "I have no hope of any good coming out of tomorrow's meeting. I have been worrying the whole night about its outcome, but I wonder if it is going to have any effect upon anybody." That night Mahdi Ali learned to respect him more than ever

- continued

CHAPTER V

MUHAMMADAN ANGLO-ORIENTAL COLLEGE

In the history of western education in India the Charter Act of 1813 was a turning point. It set aside a lac of rupees a year for the advancement of the arts and sciences. Also free entry was allowed to Christian missionaries, who among, other things, gave considerable attention to education, and established schools and colleges in major towns and cities. In 1835 Governor-General Bentinck published his Resolution based on Macaulay's Minutes. The Resolution was "of the opinion that the great object of the British Government ought to be the promotion of European literature and science among the natives of India; and that all the funds appropriated for the purpose of education would best be employed on English education alone ..... through the medium of English language."[1] Vincent Smith says this was "perhaps the most far-reaching single measure in the whole nineteenth century."[2] The next stage of development towards "extending far more widely the means of acquiring general European Knowledge" was Sir Charles Wood's Despatch of 1854. As a result of this, universities were established in Bombay, Madras and Calcutta in the year 1857. The grants-in-aid System was also introduced, which encouraged the establishment of private schools and colleges all over the country. Thus, apart from the temporary set-back caused by the "Mutiny", India was soon covered by a net-work of both government and private schools and colleges. Side by side with these educational policies, the English language became the medium of legal and administrative proceedings, making the study of English indispensable in the acquisition of official, economic and social status in the society.

In spite of the serious implications of these decisions, the Muslims remained aloof which is not altogether surprising. Hunter has expressed this eloquently. "Had the Mussalmans been wise, they would have perceived change, and accepted their fate. But an ancient conquering race cannot easily divest itself of the traditions of its nobler days."[3] Giving statistics he explains, "Even as late as 1860-62 there was only one Mussalman to ten Hindus in our school ..... the number of Muhammadan student bears no fair ratio to the Muhammaden population."[4] Such was the situation that Syed Ahmed had to confront. So while he had launched an intellectual onslaught through "Tahzibul-Akahlaq" to break

1 Quoted in "Indian Educational Policy" by W.Meston.
2 Vincent Smith - "Oxford History of India" page 718.
3 W.Hunter - "The Indian Mussalmans" page 152.
4 Ibid pages 154-155.